اسلامی نظریاتی کونسل اور انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور کے
زیر اہتمام علمی وفکری مجالس کی روداد بعنوان

جمہوریت

ایک مکالمہ

اہتمام وترتیب
محمد اسرار مدنی

ناشر: مجلس تحقیقات اسلامی

جملہ حقوقِ بحق ناشر محفوظ ہیں

جمہوریت ایک مکالمہ

اہتمام وترتیب	.....	محمد اسرار مدنی
معاونین	.....	حافظ محمد عامر ربانی، مولانا تحمید جان ازہری
ضخامت	.....	۸۸ صفحات
تعداد	.....	1100
اشاعتِ اوّل	.....	اکتوبر 2020
برائے رابطہ:	.....	0315 98 98 998

ملنے کے پتے

☆ سعید بک بینک، F-7 اسلام آباد
☆ مجلس تحقیقات پبلشرز
☆ مؤتمر المصنفین ..... جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک
☆ الحافظ کتب خانہ، سردار پلازہ، اکوڑہ خٹک
☆ اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد
☆ کتاب سرائے، اردو بازار لاہور
☆ یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار پشاور
☆ القاسم اکیڈمی ..... جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد نوشہرہ
☆ مسٹر بکس، اسلام آباد
☆ مکتبہ عمر فاروق، محلہ جنگی پشاور

فہرست

مقدمہ ۷

پیش لفظ ..... محمد اسرار مدنی

متبادل بیانیہ کی بحث اور آئین پاکستان ..... ڈاکٹر اکرام الحق یاسین ۱۲

پروگرام کا عنوان ۱۳

متبادل بیانیہ ۱۳

تحریک پاکستان اور قومی ریاست ۱۵

جمہوریت: تعارف، ارتقاء اور تاریخ ..... بیرسٹر ظفر اللہ خان ۱۶

جمہوریت پر مکالمے کے مختلف زاویئے ۱۷

جمہوریت ۱۷

جمہوریت کا آغاز ۱۸

جمہوری روایات کا پس منظر میں چلے جانا ۱۹

جمہوریت کا احیاء ۲۰

احیاء جمہوریت کی ایک ناکام کوشش ۲۲

کلیسا کے اجارہ داری کا خاتمہ ۲۲

قانون سازی کا حق کس کو؟ ۲۲

مغرب میں نظم اجتماعی کی تشکیل ۲۳

اسلامی معاشرے میں نظم اجتماعی کی تشکیل ۲۳

امامت کا ماڈل ۲۴

سنی نقطہ نظر ۲۴

شیعہ نقطہ نظر ۲۵

سنی نکتہ میں بدلاؤ ۲۵

جمہوریت پر اٹھنے والا بنیادی اعتراضات ..... پروفیسر خورشید ندیم ۲۷

خلافت ۲۹

بادشاہت ۲۹

جمہوریت ۳۰

خلاصہ کلام ۳۰

کیا جمہوریت اسلام مخالف نظام ہے ۳۰

جمہوریت میں پارلیمنٹ کا کردار ..... ظفر اللہ خان ۳۲

جمہوریت میں پارلیمنٹ کا کردار ۳۳

ہماری بدقسمتی ۳۳

پارلیمنٹ کا ارتقاء ۳۴

منتخب نمائندوں کی ضرورت اور کردار ۳۴

پاکستان کا جمہوری ورثہ ..... ڈاکٹر سلطان محمود ۳۶

موجودہ جمہوری سیٹ اپ اور برطانوی سامراج ۳۷

ہندوستانیوں کی حکومت میں شمولیت ۳۹

پاکستان میں اسلامائزیشن کی مختصر تاریخ ..... ڈاکٹر اکرام الحق ۴۲

پاکستان کی نظریاتی حیثیت ۴۳

علامہ اقبال کی تجویز ۴۵

قیام پاکستان کے بعد اسلامائزیشن ۴۵
مجلس دستور ساز میں پیش ہونے والے اعتراضات ۴۷
سید سلمان ندوی کی وزیراعظم سے اپیل ۴۷
مذہبی خطوط پر استخلاص وطن کی تحریک پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز ۴۹
مذہبی خطوط پر استخلاص وطن کی تحریک ۵۰
جمہوری فکر کی ترویج ۵۰
مذہبی فکر کی تقسیم ۵۱
قیام پاکستان کے بعد ۵۱
اسلامی نظریاتی کونسل: قیام اور کردار ۵۲
تحریک افغانستان کے بعد ۵۲
بین الاقوامی قوانین کی اہمیت جناب احمر بلال صوفی ۵۵
بین الاقوامی قوانین اور عہد رسالت ۵۶
ہم کشمیر پر جان دینے کو تیار ہے مگر تحقیق کے لئے نہیں ۵۷
کیا بین الاقوامی قوانین مسلمانوں کے خلاف سازش ہے؟ ۵۹
ایک بین الاقوامی مباحثے کی روداد ۶۰
اقوام متحدہ کی چارٹر پر دستخط غلطی تھی؟ ۶۰
وفاقی شرعی عدالت: ایک تعارف ڈاکٹر مطیع الرحمٰن ۶۲
اعلیٰ عدالتوں میں شرعی بنچز کا قیام ۶۳
وفاقی شرعی عدالت ۶۴
وفاقی شرعی عدالت کے خدوخال ۶۴
وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار ۶۴
وفاقی شرعی عدالت اور مسئلہ سود ۶۵
جمہوریت مخالف مذہبی بیانیہ مولانا ڈاکٹر عمار خان ناصر ۶۹
جمہوریت مخالف بیانیہ ۷۰

اصل مسئلہ جمہوریت نہیں قومی ریاست ہے ۷۱
قومی ریاست قابل قبول ہے کہ نہیں؟ ۷۱
مذہبی فکر کی دوعملی ۷۲
دنیا میں عروج و زوال کا قانون ۷۴
مذہبی طبقات اور بین الاقوامی قانون ۷۴
جمہوریت اور ولایت فقیہ علامہ ثاقب اکبر ۷۵
ولایت فقیہ کیا ہے؟ ۷۷
مجلس خوبرگان ۷۷
مجلس خوبرگان کے لئے طریقہ انتخاب ۷۸
مجلس خوبرگان کا دورانیہ ۷۸
شورئ نگہبان ۷۸
نظام مرجعی کیا ہے؟ ۸۰
سول ملٹری ریلیشن شپ لیفٹیننٹ جنرل (ر) نعیم خالد لودھی ۸۲
سول ملٹری تعلقات کے مسائل ۸۴
امریکہ میں سول ملٹری تعلقات ۸۴
روس میں سول ملٹری تعلقات ۸۵
اختیارات کی جنگ ۸۵
فوج معاشرے کا حصہ ہے ۸۵
پاکستان فلاحی ریاست کیوں نہ بن سکا ۸۶
فوج کی سیاست میں مداخلت ۸۷
فوجی لیڈرشپ کی ناکامی ۸۷
سیاست دانوں کی کمزوری ۸۷
جمہوریت کا استحکام کیسے ہوگا؟ ۸۸

مقدمہ

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور نے جمہوریت، اسلام اور پاکستان کے حوالے سے کئی مجالس منعقد کیں۔ ان میں سے متعدد مجالس کو اسلامی نظریاتی کونسل کا اشتراک اور تعاون بھی انہیں حاصل رہا۔ حاضرین اور سامعین میں زیادہ تر علماء دینی مدارس کے فضلاء اور ملکی جامعات کے اسلامیات کے شعبوں کے فضلاء اور محققین شامل تھے۔ گفتگو کرنے والے مہمانوں میں پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب، چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل، راقم الحروف اور فکرِ جمہوریت، قانون، دستور اور شریعت کے بہت سے ماہرین تشریف لائے اور موضوع کے متعلق سیر حاصل گفتگو ہوتی رہی۔

میرے نزدیک آج کی جمہوریت اسلام کے نظامِ شوریٰ کی معاصر شکل ہے۔ اوائلِ اسلام میں دنیا بھر میں بادشاہتیں تھیں، مگر اسلام نے ختم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرِ سرپرستی ایک نبوی نظمِ اجتماعی قائم فرمایا۔ اور اس کے بعد کئی سال تک خلافت کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس سارے عرصے میں عوام اور قائدین ایک دوسرے کے انتہائی قریب رہتے تھے۔ کہنے کو تو قائدین کا حکم چلتا تھا، مگر عوام کو رائے کی آزادی اس قدر تھی کہ بھرے مجمے میں وہ نا صرف اسلامی خلفاء سے بلکہ خود حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیا کرتے تھے اور اس پر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فقہِ اسلامی کا ارتقاء ہوا۔ فقہ کے مشہور مکاتبِ وجود میں آئے اور سرکاری سطح پر نہ سہی مگر عملاً فقہاء کی عملی کاوشوں کے نتیجے میں مرتب ہونے والی رہنمائی اور مسائل و احکام ہی ملکی قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ مسائل اگرچہ فقہاء کی سرپرستی میں مرتب ہوئے تھے۔ مگر اس میں عام زندگی کی اقدار اور رسوم و رواج

کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اور خود عوام فقہاء کی مجالس میں بھی آ کر بیٹھتے تھے اور اپنے مسائل بیان کرتے تھے۔ البتہ فقہاء قرآن و سنت کی نصوص سے باہر نہیں جاتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں جب قومی ریاستوں کی پہلی پہلی بنیادیں پڑی تو عام انتخابات متعارف ہو گئے۔

اسلامی علاقوں میں ابتداء خلافت سے ہی بیعت کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ جس میں عوام کا عمل دخل نمایاں تھا۔ قومی ریاستیں وجود میں آنے کے بعد قانون سازی کا کام عوام کے منتخب نمائندوں کے ذمہ لگایا گیا۔ اور نظمِ مملکت کو اداروں میں تقسیم کیا گیا۔ اور ان اداروں میں عوام سے قابل لوگوں کو منتخب کر کے نظمِ اجتماعی کا حصہ دار بنایا گیا، فقہ اسلامی کی صورت میں ہونے والی قانون سازی پارلیمان کے ذریعے ہونے والی قانون سازی سے زیادہ جمہوری تھی۔ مگر اسے باقاعدہ سرکاری حیثیت حاصل نہیں ہوتی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ نے تصورِ پاکستان پیش کیا، تو ان کے خطاب کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک اسلامی جمہوری ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ اسی زمانے میں تصورِ پاکستان پیش کرنے سے پہلے علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے خطبہ اجتہاد میں مسلم پارلیمان کے ذریعے اصولِ اجماع کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد کا تصور پیش کیا۔ جس میں علامہ اقبال کے بنیادی کردار کو لازم قرار دیا گیا۔ اس اجتہادی نظام کا خاکہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس کی دیگر وجوہات میں یہ وجہ بھی ذکر فرمائی کہ اس طریقے سے اجتہاد کے عمل میں بعض دفعہ شوق رکھنے والے عوام کا جو عمل دخل ہو جاتا تھا، اس سے بھی بچا جا سکے گا۔

میرے خیال میں یہ اجتہاد کے اسی اسلامی جمہوری رویے کو جو تاریخِ اسلام میں چلا آ رہا تھا ایک ادارے کی شکل دینے کی طرف اشارہ تھا۔ پاکستان بن گیا تو اسلامی جمہوری طریقے سے قانون سازی کے لئے کئی اقدامات ہوئے جن کی بنیاد قراردادِ مقاصد کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور کی یہ کاوش اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ دینی فکر و دانش کے ماہرین جو نصاب میں عموماً قرونِ وسطیٰ کے اجتہادی

نظام اور اجتہادی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر معاصر اسلامی، جمہوری لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ جو علامہ محمد اقبالؒ، قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر قائدین تحریکِ پاکستان اور ہر مکتبِ فکر کے علماء نے تحریکِ پاکستان سے لے کر تشکیل دستور تک اور تشکیلِ دستور سے لے کر آج تک مرتب کیا۔ میری نظر میں یہ مجالس مذاکرہ بہت کامیاب رہی اور ان میں ہونے والی گفتگو کی روشنی میں اس کا مقصد کافی حد تک حاصل ہوا۔ زیرِ نظر کتاب انہی خطابات کے خلاصے پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ یہ معاصر اسلامی جمہوری لٹریچر میں ایک اچھا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

ڈاکٹر اکرام الحق یاسین
سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

کہ

پیش لفظ

جمہوریت کیا ہے؟ کہاں سے شروع ہوئی؟ مختلف ادوار کیا ہیں؟ اسلام اور جمہوریت کے درمیان مفاہمت ممکن ہے؟ جمہوریت اور آمریت کا موازنہ؟ جمہوری اداروں کی کارکردگی، سول ملٹری تعلقات، بین الاقوامی قوانین سمیت پاکستان میں جمہوری نظام اور اسلامائزیشن کے چیلنجز جیسے اہم سوالات ہمیشہ پیش نظر رہے لیکن مذہبی جماعتوں، دینی مدارس، خانقاہوں اور مقامی اداروں میں ان موضوعات پر کما حقہ علمی وفکری مکالمہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی بہت سارے روایتی موقف انتہائی سرسری اور سطحی انداز میں پیش ہو رہے ہیں جس میں جذباتیت زیادہ اور دلائل کم پائے جاتے ہیں، الحمدللہ انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور (ircra) اور اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد کے اشتراک سے اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان ایک متبادل بیانیہ کے عنوان سے علمی و تحقیقی لیکچر اور مکالمے کا سلسلہ شروع ہوا، سینکڑوں شرکاء نے ہمارے منعقدہ تربیتی مجالس میں شرکت کی، موضوع کی مناسبت سے راقم نے ملک کے نامور دانشوروں اور مفکرین کو دعوت دی، ہر سیشن کے بعد سوال جواب اور آزاد ماحول میں مکالمے کا سلسلہ چلتا رہا بہت سارے شائقین علم نے ورکشاپ ومجالس میں شرکت کی خواہش ظاہر کی جو کہ محدود وسائل کی وجہ سے ہمارے لئے مشکل تھا لہذا وہ مذکورہ مجالس کی ایک جھلک ''جمہوریت ایک مکالمہ'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

کتاب ہذا میں شامل مضامین چند اہم شخصیات کے لیکچرز و خطابات کا اختصار

ہے، جب کہ ان کے تمام سیشن ہم نے VMN TV کے یوٹیوب چینل پر ڈالے ہیں، تفصیلی لیکچر یوٹیوب چینل پر ملاحظہ فرمائیں، ان مجالس کی سرپرستی چیئر مین اسلامی نظریاتی کونسل پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب نے فرمائی جبکہ IRCRA ٹیم کے ارکان جناب تحمید جان ازہری، محترمہ فائزہ حسیب سمیت اسلامی نظریاتی کونسل کی ٹیم نے بھی بھرپور تعاون کیا، خصوصاً ویڈیو لیکچرز کو زیب قرطاس کرنے میں عزیزم محمد عامر ربانی کا بھرپور کردار رہا ہے، امید ہے یہ کاوش وطن عزیز پاکستان میں جمہوریت، امن بقائے باہمی اور سماجی ہم آہنگی کے لیے مزید راہ ہموار کریگا۔

از

محمد اسرار مدنی

صدر مجلس تحقیقات اسلامی اسلام آباد

ircra313@yahoo.com

متبادل بیانیہ کی بحث اور آئین پاکستان

ڈاکٹر اکرام الحق یاسین

سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

میں آپ سب کا اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان آنے پر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔چیئر مین اسلامی نظریاتی کونسل جناب ڈاکٹر قبلہ آیاز صاحب کی طبیعت اچانک ناساز ہوگئی اور انہیں پشاور جانا پڑا۔ان کے نمائندے کی حیثیت سے چند باتیں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

پروگرام کا عنوان

پروگرام کا عنوان ہے'' اسلام،جمہوریت اور آئین پاکستان ایک متبادل بیانیہ''یعنی پہلے بیانیہ کے مقابلے میں ہم نیا بیانیہ سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں، جوملک وقوم کے فائدے میں ہو اور عمومی رجحان کے موافق ہو۔میں جو سمجھتا ہوں کہ اگر ہم ان تین اسلام،جمہوریت اور آئین پاکستان کو اپنے ملک میں یکساں طور پر جمع کرنے میں کامیاب ہوجائے تو ہمارے بیشتر مسائل حل ہوجائیں گے۔

متبادل بیانیہ

اسلام کا لغوی معنی جھک جانا،اطاعت کرنا اور انقیاد ہے۔جمہوریت عوام سے مستعار ہے یعنی وہ نظام حکومت جس میں بنیادی عمل دخل عوام کا ہو۔عوام خود اپنے حاکم کا انتخاب کریں۔عوام بتائیں کہ وہ کس طرح کا نظام چاہتے ہیں۔جمہوریت چوں کہ مغرب سے آئی ہوئی ہے اور مغرب میں جمہوریت کو اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

آئین ریاست اور عوام کے درمیان ایک طے شدہ معاہدے کا نام ہے جو کہ بتاتا ہے کہ اس میں اس ملک کے حدود اربعہ کہاں سے کہاں تک ہے اور اس ملک میں کیا نظام ہونا چاہئے؟

مغربی جمہوریت میں حاکمیت اعلی عوام کو حاصل ہوتا ہے جبکہ پاکستان کی سطح پر رائج جمہوریت ایسی نہیں ہے۔ہمارے آئین میں لکھا گیا ہے کہ حاکمیت اعلی صرف اور صرف اللہ تعالی کا حق ہوگا۔آئین میں صاف لفظوں میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنے گا۔مزید لکھا ہے کہ ملک کے لئے چند اداروں کا ہونا بہت ضروری ہوگا۔ان اداروں میں ایک ادارہ نظریاتی ہوگا۔اس مقصد کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل کا وجود عمل میں لایا گیا ہے۔

پھر بھی ہمارے ملک میں ایک طبقہ ایسا موجود رہا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت اسلام مخالف نظام ہے۔وہ کہتے ہیں:اسلام میں حاکمیت اعلی کا حق صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے۔جبکہ جمہوریت یہ حق عوام کے سپرد کرتا ہے۔

غور اگر کی جائے تو پاکستان کا کیس پورے دنیا سے ہٹ کر ہے۔دنیا بھر میں مذہب کو سیاست سے جدا کر کے ایک انفرادی چیز تصور کی جاتی ہے۔۔ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔وہ جہاں چاہے مذہبی رسومات بجالاسکتا ہے۔ریاست کا جو نظام ہوگا وہ سب کے لئے یکساں اور مشترک ہوگا اور اس میں بھی مذہب کا کوئی عمل دخل شامل نہیں ہوگا۔یہ دنیا میں جمہوریت کا تصور ہے۔یعنی باہر دنیا میں جمہوریت کا تصور سیکولرازم پر مبنی ہے جبکہ پاکستان میں ہم اسلامی جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں اور یہ اس لئے کہ پاکستان بنانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہم الگ اسلامی طرز زندگی کے ساتھ رہے۔

آزادی اور تقسیم ہندوستان سے قبل یہاں پر مغلوں کی حکومت تھی۔یہ خالص بادشاہت تھی۔اس نظام میں شرعی قوانین نافذ تھے۔مغل کو زوال آیا تو انگریز یہاں قابض ہوئے،انہوں نے بھی مسلمانوں کے فیصلے کرنے کے لئے عدالتوں میں شرعی نظام برقرار رکھا۔ججوں کی مدد کے لئے مفتی مقرر کئے۔یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا یہاں تک کہ ان کے ججز نے یہاں کی زبان سیکھی،کتابوں کی ورق گردانی کی اور مسلمانوں کے فیصلے ان کے مذہب کے مطابق کرنے لگے۔

تحریک پاکستان اورقومی ریاست

جب پاکستان کی تحریک چلی۔ یہ طے ہوا کہ ہم علیحدہ ریاست بنانا چاہتے ہیں جو کہ ایک قومی ریاست ہوگی۔اس ریاست کا دارومدار علاقہ پر ہوگی۔ ہندوستان کے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ اس ریاست کا حصہ ہوں گے مگرافسوس کی بات یہ ہے کہ ہمیں جو علاقہ ملا وہ مربوط نہیں تھا، ایک حصہ مشرق میں تھا تو ایک مغرب میں۔ایک کو مشرقی پاکستان کہا جاتا تھا جبکہ دوسرے کو مغربی پاکستان۔ بدقسمتی سے ہمارا مشرقی حصہ اب ہم سے بچھڑ کر بنگلا دیش بن چکا ہے۔ پھر قومی ریاست کے طور پر فیصلہ کیا گیا۔ ہمارا مذہب اسلام ہوگا۔علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ نے ملکی پارلیمان کا جو تصور دیا تھا وہ یہ تھا۔کہ ہم پارلیمان کا ڈھانچہ مغرب سے لینگے۔ ہمارے قانون شریعت ہوگی۔ہم عوامی نمائندوں کے ساتھ ساتھ مضبوط بنیاد رکھنے والے علماء کرام کو بھی پارلیمان کا حصہ بنائینگے۔ پھرمل بیٹھ کر اجتہاد کے بنیاد پر شریعت کے موافق قانون سازی کی جائے گی۔ یہ تصورانہوں نے اپنے خطبہ اجتہاد میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

میرے خیال میں متبادل بیانیہ یہ ہے کہہم نے اب تک اسلام کا کون سا تصور فہم کیا تھا اوراب کون سا سمجھنے کی ضرورت ہے؟ جمہوریت کا دوسرے ملکوں کے لئے بیانیہ کیا ہے اور پاکستان کے لئے کیا؟ آئین پاکستان اسلام اور جمہوریت دونوں کے تقاضے پورا کرسکتے ہیں کہ نہیں؟۔ یہاں پر بہت سارے اہل علم آئینگے۔آپ کے سامنے نئے نئے گرہیں کھلیں گے۔امید ہے آپ جب اس ورکشاپ سے فارغ ہوں گے تو یہ سلسلہ آگے بڑھاؤ گے۔ یہ ان شاءاللہ ہمارے ملک کے لئے بہت مفید ہوگا۔

(پروفیسرڈاکٹر)اکرام الحق یاسین
سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

جمہوریت تعارف ،ارتقاء اور تاریخ

بیرسٹرظفراللہ خان
مصنف ،دانشورسابق وفاقی وزیرقانون

جمہوریت پر مکالمے کے مختلف زاویئے

جمہوریت (Democracy) کے کئی زاویئے ہے۔ ہر زاویہ دوسرے سے مختلف ہے۔ فلسفے میں ایک کہاوت بہت مشہور ہے شاید آپ نے سنی ہوگی ''افلاطون کا غار''اس کہاوت کا لب لباب یہ ہے کہ ہر آدمی کا سوچ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں اس کے متبادل کے طور پر دوسرا محاورہ بہت مشہور ہے'' نابینا اور ہاتھی'' ہوا یوں کہ کئی نابینا دوست تھے۔سب ہاتھی دیکھنے چلیں گئے۔ ایک نے ہاتھی کے ٹانگ کو ہاتھ لگایا تو کہا: ہاتھی لمبا ہوتا ہے۔ایک نے سونڈھ پر ہاتھ رکھ کر کہا: ہاتھی یوں ہوتا ہے۔جس نے ہاتھی کے دانتوں کو ہاتھ لگایا اس نے کہا ہاتھی یوں ہوتا ہے۔

جمہوریت بھی ایسا ہے۔صرف جمہوریت نہیں بلکہ دین اسلام کا ہر حکم ایسا ہی ہے۔آپ ایک نظر سے دیکھیں گے تو ایک معنی دیگا۔دوسری نظر سے دیکھیں گے تو کچھ اور دکھے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ معنی ٹھیک ہے اور وہ غلط۔ہوتا دراصل یہ ہے کہ ایک شخص اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اس کو اسلام کا ایک پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے جبکہ دوسرا اس کو دوسرے نظر سے دیکھ کر دوسرے پہلو کو اجاگر کر رہا ہوتا ہے۔

جمہوریت(Democracy)

جمہوریت انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ یہ دراصل لاطینی گریک زبان سے منتقل ہوا ہے۔ہم اگر اس کے لغوی معنی پر غور کرے تو ''ڈیمو(Demo)'' عوام کو اور کریسی (cracy)سسٹم آف گورنمنٹ کو کہا جاتا ہے۔یعنی عوام کی حکومت۔

یونانی مفکر ہیروڈوٹس(Hearodotus)نے جمہوریت کی تعریف یوں کی ہے کہ جمہوریت ایک ایسی حکومت ہوتی ہے جس میں ریاست کے حاکمانہ اختیارات پورے

معاشرے کو حاصل ہوتے ہیں۔

سابق امریکی صدر ابراہم لنکن کا قول ہے

Goverment of The People by The people for the people

یعنی عوام کی حاکمیت،عوام کے زریعے ،عوام پر۔جمہوریت کی یہ تعریف محض اس کے ایک پہلو کی وضاحت ہے۔بعض اہل علم کے نزدیک جمہوریت ایک سماجی رویہ ہے اور اس بنیاد پر اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ انسانی شخصیت(Human personality) کا احترام ہے اور اس احترام کا حق دار معاشرے کا ہر فرد ہے۔

جمہوریت کا آغاز

جمہوریت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔جمہوریت کا سب سے پہلا تصور ہندوستان میں ملتا ہے۔۶ صد سال قبل از مسیح اور بدھا کی پیدائش سے قبل اس خطے میں جمہوری ریاستیں موجود تھیں اور ان کو جانا پداس(jana padas) کہا جاتا تھا۔اس میں سب سے پہلی ریاست وشانی ریاست تھی ۔اس ریاست میں موجودہ ''بہار'' اور مضافات کے علاقے شامل تھے۔

یونان میں بھی جمہوریت موجود رہی ہے لیکن وہاں جمہوریت کا تصور نہایت سادہ اور محدود تھا۔وہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھی۔ایک ایک شہر الگ الگ ریاست ہوتا تھا۔شہر بھی بڑے بڑے نہیں تھے۔یونان کا سب سے بڑا شہر ایتھنز(Athens) تھا اور اس کی آبادی زیادہ سے زیادہ دس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔چھوٹی سی ریاست اور محدود آبادی ہونے کی وجہ سے وہاں جمہوریت کا تصور یہ تھا کہ بادشاہ بڑے بڑے اور اہم امور میں عوام کی رائے جاننے کی کوشش کرتا،اعلان کیا جاتا اور لوگ ایک جگہ اکھٹے ہوجاتے تھے ۔یہ تب تک ممکن تھا جب تک آبادی محدود اور ریاست چھوٹی اور مختصر تھی، یہ نظام کسی حد تک تو مفید تھا مگر کافی یہ بھی نہیں تھا۔اس میں افاقیت کی روح موجود نہ تھی۔صرف ریاست کے شہری طبقہ کو اس سے مستفید ہونے کا حق حاصل تھا اور وہ بھی ان ہی لوگوں کو

جو ریاست کی حدود میں پیدا ہوئے ہوں، حالاں کہ یہ طبقہ عددی اعتبار سے اقلیت میں تھا، جو لوگ ریاست کے پیدائشی باشندے نہیں تھے ان کو اور غلاموں کو کوئی قانونی استحقاق حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ان حامیوں کے باوجود یہ نظام یونان میں کافی عرصہ موجود رہا۔

اس عہد میں یونان کے بعد روم دوسرا ملک تھا جس نے جمہوری روایت کے تسلسل کو آگے بڑھایا، رومی ریاست نے جمہوریت میں دو چیزوں کا اضافہ کیا۔ ایک یہ کہ جمہور کی مرضی ہی تمام فیصلوں کی بنیاد ہے۔ دوسری بات یہ کہ تمام انسان مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

جمہوری روایات کا پس منظر میں چلے جانا

آبادی میں اضافہ اور ملکوں میں وسعت آنے سے جمہوری فکر کا وہ ناقص ڈھانچہ بھی ایک زمانے کے لئے پس منظر میں چلا گیا۔ اس کی جگہ مطلق العنان شہنشاہیت نے لے لی۔ یہ وہ دور تھا جب مغرب میں تین قوتیں فیصلہ کن تھیں۔ ۱۔ بادشاہ، ۲۔ جاگیردار اور ۳۔ کلیسا۔ قوت کے یہی تین مراکز تھے۔ تینوں مل کر حکومت کرتے تھے۔ سلطنت روم کے بعد معاشرے میں کلیسا کی سماجی حیثیت اور بھی بڑھ گئی، یہاں تک کے بادشاہ کا انتخاب بھی کلیسا کرنے لگ گئی۔ کلیسا نے عوام پر اپنا استبدادی پنجہ گاڑ رکھا تھا۔ کلیسا کے بیان کئے ہوئے افکار و نظریات سے سرمو اختلاف کرنے کی کسی میں جرأت نہیں تھیں۔ جو شخص اختلاف کرتا اسے بدعتی قرار دے کر سخت سزائیں دی جاتی۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کو زندہ بھی جلا دیا گیا ہے۔

برونو نام کا ایک سائنسدان تھے۔ یہ بنیادی طور پر پادری تھے اور تیونس کے چرچ میں ہوتے تھے۔ یہ تھوڑے سے روشن خیال تھے جیسے کہ ابن رشد ابن سینا کی مثال آپ لے لیجئے۔ اس نے عام فکر سے ہٹ کر ایک خیال پیش کیا کہ زمین مسلسل حرکت کرتی ہے۔ لوگوں نے اس پر شکایت کی، مقدمہ چلا۔ عدالت نے کہا کہ تم اس نظریہ سے توبہ تائب ہو جاؤ۔ پادری بھی مزاج کے سخت تھے۔ انکار کر دیا۔ اعلان کیا گیا کہ سب فلاں جگہ جمع ہو۔ لوگ جمع ہو گئے۔ پادری تشریف لائے۔ اس کو ایک لکڑی کے ساتھ باندھ دیا

گیا۔ آگ لگا دی گئی اور اسے زندہ جلا دیا گیا۔ ان کا یہی طریقہ تھا فلاں کو مارو، گرفتار کرو، جیل میں ڈالو اور قتل کرو۔ لوگ بہت تنگ آ گئے، اس کے بعد ہوا یہ کہ کلیسا والے اختلافات کے شکار ہوئے اور کئی ایک فرقے بن گئے۔ مشہور فرقے دو تھے، ایک کیتھولک اور ایک پروٹسٹنٹ کچھ ممالک ایک فرقے سے وابستہ تھے تو کچھ دوسرے سے، انہوں نے اس بنیاد پر ایک دوسرے سے جنگ کی، اب تو لوگ اور بھی تنگ آ گئے۔

جمہوریت کا احیاء

نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں علوم منتقل ہونا شروع ہوئے تو لوگوں میں اپنی طرف سے سوچنے سمجھنے کا رجحان بھی پیدا ہوا اور زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑے بڑے ماہرین اور صاحبان علم پیدا ہوئے۔ جنہوں نے دارلامراء، کلیسا اور جاگیرداروں کے خلاف مزاحمت کی۔ ان میں کئی ایک نام قابل ذکر ہے۔ ان میں پہلا نام وولٹائر کا ہے یہ ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء میں پیدا ہوا اور ۳۰ مئی ۱۷۷۸ء میں انتقال کر گیا، اس نے فلسفہ، جدید سائنس اور مارشل آرٹ وغیرہ میں کئی کتابیں لکھی ہے، ان کا ماننا تھا کہ دنیا میں جتنی بھی مذاہب ہے وہ سب کے سب تحریف شدہ ہے اور تمام انسانوں کا ایک ہی مذہب ہے اور وہ ہے فطری مذہب (natural religion) وولٹائر وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مذہب اور ریاست دو علیحدہ چیزیں ہیں، اس نظریہ کے بنیاد پر سیکولرازم وجود میں آیا

دوسرا نام مونٹیسکو کا ہے۔ یہ ۱۸ جنوری ۱۶۸۹ء میں ہوئے اور ۱۰ فروری کو انتقال کر گئے۔ اس کا کتاب سفرٹ آف لاء (Sprit of Law) بہت مشہور ہے۔ یہ کتاب فلسفہ اور قانون کے موضوع پر ہے۔ مگر اس میں جمہوریت کے متعلق اپنا نظریہ بڑے شد و مد سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہے دنیا میں جتنی خرابیاں ہیں، حقوق کے تلف ہے یہ سب مطلق العنانیت اور طاقت اور اختیارات کے ایک جگہ جمع ہونے کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا بہتر نتائج اس وقت تک حاصل نہیں کئے جا سکتے جب تک اختیارات مختلف جہتوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

کہا: ریاست میں دراصل تین قسم کے اختیارات ہیں۔

۱۔ قانون سازی کا اختیار

۲۔ ملک کا نظام قانون کے مطابق چلانے کا اختیار

۳۔ تنازع پیدا ہوتو قانون کے دائرے میں اسے حل کرنے کا اختیار۔

مونٹیسکو کے نظریہ کے مطابق یہ تینوں اختیار کسی ایک شخص یا ادارے میں مرتکز نہیں ہونے چاہئے۔ بلکہ ہر ایک کے لئے الگ ادارہ ہو اور ہر ادارہ الگ طور پر بااختیار ہو۔اسی طرح ایک ادارے کو دوسرے ادارے کے کام میں عمل دخل کا کوئی اختیار نہ ہو۔قانون سازی کا اختیار جس ادارے کو حاصل ہوتا ہے اس کو آج کل مقنّنہ، قانون کے مطابق ملک چلانے کا اختیار جس ادارے کو حاصل ہے اس کو انتظامیہ جبکہ تصفیہ کرنے والے ادارے کو عدلیہ کہا جاتا ہے۔

تیسرا شخص جس نے جمہوریت کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا ہے، وہ روسو ہے۔اس کی پیدائش ۲۸ جون ۱۷۱۲ء میں اور وفات ۲ جولائی ۱۷۷۸ء میں ہوئی۔روسو پہلا شخص ہے جس نے دو باتوں پر زور دیا، ایک فرد کی آزادی اور دوسری آفراد کی نمائیندہ حکومت۔یعنی عوام کو یہ حق ہونا چاہئے کہ وہ جب چاہے کوئی حکومت بنائیں اور جب چاہے ختم کردیں۔ یہ تین فرانسیسی مفکرین ہے جن کے نظریات اور افکار سے جمہوریت کشید کرلی گئی ہے۔ان مفکرین کی نظریات نے عوام کو ایک سوچ و ولولہ دیا، جن سے ان میں آزادی کی ایک جستجو پیدا ہوگئی اور سب اپنے اوپر مسلط ظالم اور جابر قوتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

احیاء جمہوریت کی ایک ناکام کوشش

سولہ صدی عیسوی میں اصلاح کلیسا کی تحریک چلی۔ یہ تحریک مارٹن لوتھر (۱۴۸۳-۱۵۴۲ء) کی برپا کردہ تھی۔اس سے امید پیدا ہوگئی تھی کہ اب مغرب میں جمہوریت کا احیاء ہوجائے گا۔ یہ امید اس لئے بھی جاگ گئی تھی کہ پوپ کی شہنشاہیت کا

خاتمہ ہوگیا تھا۔جاگیرداری نظام اپنے آخری سانسیں لے رہا تھا۔مگر بدقسمتی سے یہ امید تب موہون ثابت ہوئی جب اس تحریک کی کامیابی سے وجود میں آنے والے قومی ریاستوں پر مطلق العنان شہنشاہیت قابض ہوگئی۔خدائی اختیارات کے مالک بادشاہوں نے حکومت کے تمام اختیارات اور وسائل کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ایک مرکزی انتظامی نظام کے تحت ساری قوم پر آمرانہ تسلط قائم کرلیا۔

کلیسا کے اجارہ داری کا خاتمہ

پروٹیسٹینزم کلیسا کے اس اجارہ داری کے خلاف بنی تحریک تھی۔ یہ مذہب کے خلاف نہیں تھی بلکہ اس نے اہل مذہب کو چیلنج کیا۔کلیسا کی اجارہ داری کو چیلنج کیا۔مذہب میں انسانی آزادی کے لئے آواز اٹھائی۔خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بننے پر نکیر کی۔سرمایہ دارانہ نظام معاشی پہلو سے آیا تھا۔اس سے سیکولر ازم برامد ہوا، جس نے معاشرے اور کلیسا کے درمیان تعلق کی ہی نفی کردی۔سیکولر ازم کے بنیاد پر جو نظام وجود میں آیا اس میں قانون سازی کا حق بلاشرکت غیر عوامی نمائندوں کو دیا گیا۔

قانون سازی کا حق کس کو ہے؟

قانون سازی کا حق کس کے پاس ہونی چاہئے؟ انسانی تاریخ میں اگر آپ غور کریں تو ہمیشہ سے اس کی چار شکلیں رہی ہے۔

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کہے میں اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ مجھے فرامین ملتی ہے۔آپ کو میرا کہا ماننا ہوگا۔ ہر اس کام کو کرنا ہوگا جس کا میں حکم دوں، جس سے منع کروں منع ہونا ہوگا۔

۲۔ بادشاہ۔کوئی شخص باپ دادا کے بعد حاکم اور سلطان بنے، کہے میرا حکم آخری اور واجب التعمیل ہے۔ ہر شخص پر اتباع لازم ہے۔

۳۔ طاقت۔طاقت کے زور پر حکومت پر قبضہ کرنے والا جیسا کہ مارشل لاء میں ہوتا ہے۔

۴۔ عوامی نمائندے۔آخری صورت یہ ہے کہ عوام کسی آدمی کو منتخب کریں وہ عوام کا نمائندہ بن کر عوام کی مرضی سے فیصلہ کیا کریں۔انسانی تاریخ میں حق قانون سازی رکھنے والے یہی چار گروہ گزرے ہے۔

مغرب میں نظم اجتماعی کی تشکیل

بیسویں صدی میں عالمی وار کے نتیجے میں قومی ریاستیں وجود میں آنے لگیں تو عالمی سطح پر چند چیزوں پر اتفاق ناگزیر ہوگیا

۱۔ فیصلہ کرنے کا اختیار عوام کے پاس ہوگا۔

۲۔ آئین کی بنیاد پر سیاسی نظم کی تشکیل۔

آئین عمرانی معاہدہ ہے۔اس معاہدے کے رو سے طاقت تقسیم ہوگیا۔ مقنّنہ،انتظامیہ اورعدلیہ۔قومی ریاست کے یہ تین بنیادی ستون قرار پائے۔اب ان حصوں کے حقوق وفرائض کے تعیین کے لئے ایک دستاویز بنائی گئی جسے آئین کا نام دیا گیا۔یوں آئین کی روایت پیدا ہوئی اور پورے دنیا بالخصوص مغرب میں رفتہ رفتہ اجتماعی نظم اختیار کی جانے لگی۔

اسلامی معاشرے میں نظم اجتماعی کی تشکیل

نظم اجتماعی صرف مغرب یا دوسرے اقوام کا مسئلہ نہیں تھا۔مسلمان بھی اس کے شکار تھے۔ان کے لئے بھی نظم اجتماعی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ان کے سامنے تاریخی اعتبار سے دو ماڈل تھے۔

۱۔ خلافت

۲۔ امامت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک حیات رہے۔آپ کی دو حیثیتیں تھیں۔ایک ریاست کے سربراہ اور ایک اللہ کا رسول ہونا۔پیغمبر کا چوں کہ کوئی مذہبی جانشین نہیں ہوتا کیوں کہ دین مکمل ہوگیا ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ایمان

لانے والا ہر شخص برابر ہوتا ہے، وہ مذہب کو لیکر چلنے کے پابند ہے۔البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ ایک سیاسی نظم چھوڑ کے جارہے تھے اس وجہ سے سیاسی جانشین کا انتخاب ضروری تھا۔

امامت کا ماڈل

دوسرا ماڈل امامت کا ماڈل ہے۔اہل تشیع کا سواد اعظم اثنا عشریہ بارہ ائمہ کے قائل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق امام پیغمبر کا سیاسی اور مذہبی جانشین ہوتا ہے۔امام کو ہوتے ہوئے کسی اور سے راہنمائی نہیں لی جاسکتی۔اہل سنت والجماعت اور اہل تشیع کے مابین اختلاف بھی اسی بنیاد پر ہے۔ان کے نذدیک حضرت علی کے ہوتے ہوئے کسی اور کی حکومت اور سلطہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مختصرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نیابت نبوت صلی اللہ علیہ وسلم پر دو نقطہ ہائے نظر بن گئے۔

(۱) سنی نقطہ نظر

(۲) شیعہ نقطہ نظر

سنی نقطہ نظر

سنی نظریہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نبوت ختم ہوگئی اب ان کا جانشین سیاسی حیثیت سے نیابت کرے گا، اس کا مذہب میں تغیر وتبدل اور دوسرے امور سے کوئی سروکار نہیں ہوگا اور وہ ووٹنگ کے زریعے منتخب ہوگا۔سقیفہ بنو ساعدہ میں اس زمانے کے مطابق ووٹنگ ہی ہوئی تھی۔مسلمانوں کے تین گروہ تھے۔ ایک مہاجرین اور جمہور امت کا گروہ تھا،جن کی قیادت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کررہے تھے۔ دوسرا گروہ اہل بیت کا تھا جبکہ ایک گروہ انصار کا تھا۔سب نے ابوبکر صدیق رض کو متفقہ طور پر خلیفہ منتخب کیا۔

آپ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے جو خطبہ دیا اس سے سنی نقطہ نظر کی

وضاحت ہوجاتی ہے کہ شخصیات اہم نہیں ہوتیں بلکہ قانون سب سے بالاتر ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر میں قانون پر عمل کروں تو آپ سب پر میری اطاعت واجب ہوگی اور اگر میں قرآن وسنت پر عمل نہیں کرونگا تو آپ پر بھی میری اطاعت واجب نہیں ہے۔

شیعہ نقطہ نظر

شیعہ نقطہ نظر سے نبی کا خلیفہ، اللہ کی طرف سے منتخب کردہ ہونا چاہئے۔اس کی انتخاب کے لئے الیکشن نہیں ہوتا۔اب جب کسی کا انتخاب اللہ کی طرف سے ہوجائے تو لازمی بات ہے، اس کی اختیارات بھی بڑھ جانے چاہئے۔کیسے بڑھ جانے چاہئے؟ ابوبکر صدیق کہتا ہے میں قانون کے تابع ہوں گا۔جب کہ شیعہ کے ہاں خلیفہ مامور من اللہ ہے ،ان کے اختیارات عام حکمران سے بڑھ کر ہے۔وہ جو کہے گا وہ ایک قانونی اور دستوری حیثیت اختیار کرے گا۔

سنی نکتہ نظر میں بدلاؤ

ابتدائی دورانیہ میں اہل سنت کا وہی موقف تھا جو اوپر ذکر ہوا ہے۔اس کے بعد دوسرا دورانیہ شروع ہوتا ہے۔یہ دورانیہ ہمارے لئے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ہمارے ہاں نئے نظریات متعارف ہوئے۔اب لوگ کہنے لگے۔ جو خلیفہ ہے وہ بھی مامور من اللہ ہوتا ہے۔شیعہ پہلے سے اس تصور (concept) کے ماننے والے تھے۔اب سنی بھی شیعوں کی مخالفت کرتے کرتے اس نقطے تک آپہنچے۔یہاں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی جانشین نے بھی یہ کہنا شروع کیا کہ میں اللہ کی طرف سے ہوں لھذا آپ کو میری بات ماننی پڑھے گی۔

السلطان ظل الله فی الارض اس کی کئی تعبیریں میرے ذہن میں موجود ہے مگر عمومی تعبیر جو مسلمان بادشاہوں نے اختیار کی وہ یہی تھی کہ میرا حکم چلے گا۔کیوں چلے گا؟ کیوں کہ مجھے اللہ نے یہ حق دیا ہے۔

اس کا نقصان کیا ہے؟ اس کا بہت زیادہ نقصان تھا وہ یہ کہ اس طرح شخصیات

اور قانون ایک ہوگئے۔اب قانون قانون نہیں رہا۔خلیفہ اور بادشاہ سب کچھ تھا، وہ قانون تھا اور وہ ہی دستور۔جس نے مخالفت کی ان کو خفت اٹھانی پڑی۔چاہے وہ وقت کے ائمہ کیوں نہ تھے۔انہوں نے خود ہی اپنے بعد ولی عہد مقرر کئے۔کسی کے لئے کوئی ووٹنگ نہیں ہوئی بلکہ جسے چاہا اسے نامزد کردیا۔

مسلمانوں میں دونوں مکاتب فکر (سنی، شیعہ) نے اپنے تاریخی ورثہ اور نئے عہد کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں کو مکس کر کے دونوں کی ملی جلی شکل بنانے کی کوشش کی۔اہل تشیع میں امام خمینی اور سنیوں میں مولانا مودودی اس نئے فکر کے مجتہدین میں سے ہے۔اس فکر کے بنیاد پر ہم نے آئین میں قرارداد مقاصد کو شامل کیا اور فیصلہ کا اختیار بھی عوام کو دے دیا۔

متبادل بیانیہ یہ کہتا ہے کہ نظام خالص جمہوری اصولوں پر چلے گا۔اس کے علاوہ کوئی راستہ آپ کے پاس موجود نہیں ہے۔آپ اس کو زمانے کا جبر کہہ لے یا کچھ اور۔دینی تشخص کو زندہ رکھنا ہے تو آپ معاشرے اور نظام اقدار کو اپنے جدوجہد کا مرکز بنائے کیوں کہ آپ کا جو نظام اقدار ہوگا وہ آپ کے سیاسی ں نظم میں ظاہر ہوگا۔معاشرہ اور قانون الگ الگ نہیں چل سکتے۔حدود قوانین کو نافذ ہوئے ۳۲ سال سے زائد عرصہ ہوگیا ہے مگر کسی ایک شخص کو بھی ابھی تک اس پر سزا نہیں ہوئی۔کیوں؟ کیوں کہ آپ وہ لوازمات ہی پورا نہیں کرسکے جو حدود کے نفاذ کے لئے ضروری ہے۔حد زنا کے اجراء کے لئے چار عادل اور نیک مردوں کی گواہی ضروری ہے، اب آپ اس معاشرے میں چار مرد کیسے تلاش کریں گے جو فقہ کے اصولوں پر پورا اترتے ہو۔آپ وہ گواہی نہیں لاسکتے جو حد کے نفاذ کے لئے بنیادی مطالبہ ہے۔

جمہوریت پر اٹھنے والے اعتراضات

خورشید ندیم
ممبر اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

سیاسی نظام میرے اور آپ کے مرضی سے نہیں بنتا بلکہ یہ فطری یا پھر ناگزیر وجوہات کے بنا پر بنتا ہے۔انسان غور وفکر کرتا ہے۔یہ چیز انسانوں کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔ظاہری بات ہے۔سوچتا ہے تو درپیش مسائل کا حل بھی تلاش کرتا ہے۔کبھی تجربات،کبھی مشاہدات اور کبھی غور وفکر کے ایک عمل کے شکل میں سامنے آتا ہے۔یہ ایک مسلسل عمل ہے جو کہ جاری ہے اور رہے گا۔یہ نہ تو میرے کہنے سے شروع ہوا ہے اور نہ ہی میرے کہنے پر رکھے گا۔انسان جاندار ہے اور جاندار اپنے بقاء کی کوشش کرتے رہتے ہیں انساب بھی اسی کوشش میں رہتا ہے۔شکار کرکے خوراک حاصل کرتا ہے۔پہننے اور استعمال کے لئے چمڑے کی حصول چاہتا ہے۔سایہ تلاش کرتا ہے تاکہ تپش سے بچ سکے۔یہ انسان کے فطری ضروریات ہے جو اس میں ودیعت ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔انسان مختلف ادوار سے گزر کر ''زرعی دور'' میں آیا۔زرعی دور میں زیادہ کام کرنے والے ہاتھوں کی ضرورت تھی جو کہ زراعت کرکے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل تلاش کرسکے،اس طرح نرینہ اولاد کی برتری اور جوائنٹ فیملی سسٹم کا ایک تصور ذہنوں میں آیا کیوں کہ کھیت میں عورتیں تو کام نہیں کرتی تھیں ۔زراعت چوں کہ دریا کنارے ہوتے تھی تو آپ ملاحظہ کرے پرانے زمانے میں دریاوں کے آس پاس زیادہ آبادی ہوتی تھی کیوں کہ زراعت کی بنیادی ضرورت پانی ہوتی ہے جبکہ ریگستانی علاقوں میں آبادی نہ ہونے کی برابر ہوتی تھی۔

اس کے بعد جب زرعی دور ختم ہوا اور انسان صنعتی دور میں داخل ہوا۔اب روزگار اور وسائل کے حصول کے اسباب زمین سے نکل کر مشینوں سے وابستہ ہونے لگے،مشینوں نے دس دس بندوں کا کام آکھیلے میں کرنا شروع کردیا،اب یہ ہوا کہ افرادی قوت کا جو تصور تھا وہ تبدیل ہوگیا،اب ایک کنیشن کا ماہر ان دس بندوں سے بہتر ہے جو

ٹیکنیشن کے ماہر نہ ہو۔یعنی بازوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی بلکہ اب دارومدار ذہنی صلاحیت پر منتقل ہوئی۔فیکٹریاں چوں کہ شہروں میں لگتی تھی جہاں آمدورفت آسان ہو،اس وجہ سے لوگ شہروں کی طرف منتقل ہونا شروع ہوئے، جوائنٹ فیملی سسٹم سے نیوکلیئر فیملی سسٹم کا رواج آیا اور نرینہ کی جو خواہش تھی وہ بدلنے لگی ،اب بیٹی اور بیٹے میں جو فرق کا تصور تھا وہ کم ہونے لگا۔وہ بیٹی جو زیادہ بیدار مغز ہو وہ اس بیٹے سے زیادہ بہتر ہے جو بیدار مغز نہ ہو۔

ادوار کا یہ بدلنا تاریخ وتہذیب کا جبر ہے۔یہ مشرق،مغرب،عیسائی، یہودی یا کسی مسلمان کے بس میں نہیں ہے۔یہ ادوار بدلتے رہتے ہیں جبکہ انسان صرف خاموش تماشائی بن کر تھکتا رہ جاتا ہے۔

اس طرح دفاع کا مسئلہ بھی درپیش تھا کہ باہر سے آنے والا کوئی قوت حملہ آور ہوتو ان سے دفاع کس طرح ممکن ہوگا ؟اس کے لئے ایک اجتماعی نظم کی ضرورت تھی اور یوں ریاست کا تصور وجود میں آگیا۔اب امور سلطنت کس طرح چلے گا؟

مختلف طرز ہائے حکومت

اس کے تناظر میں اب تک تین نظام وضع ہو چکے ہیں جو کہ مختلف ادوار میں مختلف قوموں میں رائج رہے ہیں۔

خلافت

اس نظام یہ تھا کہ کوئی شخص کہتا تھا میں خدا کا نمائندہ ہوں۔آپ سب کو میرا کہا ماننا ہوگا۔میں قانون ہوں اور میں ہی نظام۔یہ نظام خدائی نظام ہوتا تھا،اس میں بہتری ہی بہتری ہوتی تھی مگر مرور زمانہ سے اس میں جعلی لوگ بھی پیدا ہوگئے جیسا کہ کلیسا کا جبر و ستم مشہور ہے۔اس وجہ لوگ اس نظام کو ماننے کو تیار نہ رہے۔

بادشاہت

امور ریاست کی تشکیل کے لئے ایک نظام بادشاہت پر مبنی تھا جس میں ایک

سربراہ ہوتا تھا۔وہ پورے امور سلطنت کا یکتا متصرف ہوتا تھا۔اس نظام میں یہ مسئلہ تھا کہ ایک شخص سب کچھ تھا،وہ جو کہتا تھا،فرمان بن جاتا تھا۔

بادشاہت میں نقل اقتدار کے لئے دو طریقے رائج تھے۔۱۔موروثیت کہ میرا باپ حکمران تھا سو ان کے بعد میں بھی حکمران ہوں گا۔۲۔دوسرا طریقہ زور بازو سے زمام حکومت پر قبضہ کرنے کا تھا۔

جمہوریت

لوگوں کے حقوق کیا ہے؟انہیں کس کس چیز کی ضرورت ہے؟اس کی فکر بادشاہت میں کسی کو نہیں ہوتی تھی۔لوگوں پر کون کونسے ٹیکس لگانے ہے؟اس کا فیصلہ دارالامراء کرتا تھا یا پھر بادشاہ خود کرتے تھے،اس وجہ سے لوگوں میں نفرت پیدا ہونا شروع ہوا اور لوگ ایسے نظام کا مطالبہ کرنے لگے جس میں ان کی نمائندگی ہو اور ان کی مرضی سے فیصلے ہو۔اس عرض سے طویل جدوجہد کے بعد یہ طے ہوا کہ اب قومی ریاستیں بنے گی جو جمہوری طرز پر مبنی ہوگی۔اس میں ایک عمرانی معاہدے کا وجود ہوگا جس پر پوری قوم متفق ہوگی۔

خلاصہ کلام

اس سارے بحث کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ جمہوریت مغرب کی سازش ہے اور نہ مشرق کی کمزوری، بلکہ یہ ایک ارتقائی عمل ہے جس کے بعد دنیا نے یہاں تک پہنچنا تھا اور وہ پہنچ گئی۔

کیا جمہوریت اسلام مخالف نظام ہے

اب سوال یہ ہے کہ ایک مذہبی بندے کے لئے اس عمل کو قبول کرنے میں کوئی قباحت ہے؟ یا اس کا تصور مذہب اس انسانی ارتقاء کے برخلاف کھڑا ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے جس کی کوکھ سے کئی ایک بنیادی سوالات جنم لیتے ہیں۔

پہلے بات تو یہ ذہن نشین کرلے کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو وہ انسان کے

ارتقائی عمل کے سامنے کھڑا نہیں رہ سکتا۔اس کو ختم ہونا ہے۔اس وجہ سے ہم اسلام کت متعلق کہتے ہیں: یہ دین فطرت ہے کیوں یہ انسان کے فطری ارتقاء کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے سامنے رکھ کر آگے بڑھنے کا کہتا ہے۔

اسلام دو طرح کے احکامات صادر کرتا ہے،انفرادی کہ تم باپ ہو، بیٹے ہو، سربراہ ریاست ہو، عالم ہو تمہاری یہ ذمہ داری ہے اور تم نے یہ یہ حکم ماننا ہے۔اس کے علاوہ ایک اجتماعی امور ہے اس میں اسلام کے اصول بہت واضح ہے جس کو قرآن دوٹوک الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ وامرہم شوری بینم ۔یہ حکم اس اصول پر دیتا ہے کہ دنیا میں وہی سیاسی نظام کامیاب ہوتا ہے جو کہ عوامی اعتماد اور عصبیت پر قائم ہوتا ہے۔جو نظام عوامی عصبیت کے بجائے جبر کے بل بوتے کھڑا کیا گیا ہو وہ ناکام رہتا ہے، جوں ہی جبر میں کمی آنے لگتی ہے نظام لڑکھڑا جاتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الائمہ من قریش اور پھر اس کی تشریح خود فرمائی کہ یہ اس لئے کہ لوگ قریش کے اتباع کرتے ہیں۔لوگوں کے اچھے قریش کے اچھوں اور برے قریش کے بروں کی اتباع کرتے ہیں۔یعنی سیاسی نظام وہی بہتر ہے جس میں عوام کی مرضی کو کلیدی حیثیت حاصل ہو۔اسلامی تاریخ میں اس کے کئی شواہد میں دکھا سکتا ہوں۔سقیفہ بنی ساعدہ کی مثال لے لیجئے۔سربراہاں قبائل (جو کہ اپنے اپنے قبیلے کی نمائندگی کررہے تھے) نے حضرت ابوبکر صدیق رض کو بالاتفاق خلیفہ نامزد کیا۔گویا اس زمانے کے لحاظ سے ووٹنگ ہوئی اور ابوبکر صدیقؓ کامیاب ہوئے۔ جمہوریت پر اگر آپ غور کرے تو یہ بھی ایسا ہی نظام ہے۔عوامی رائے کو اہمیت حاصل ہے اور سب مل کر کسی کو اپنا سربراہ مقرر کرتے ہیں۔اس وجہ سے بحیثیت ایک مسلمان مجھے اس نظام میں کوئی خرابی نظر نہیں آرہی۔

جمہوریت میں پارلیمنٹ کا کردار

جناب ظفراللہ صاحب
سابق ڈائریکٹر پاکستان انسٹیٹیوٹ فار پارلیمنٹری اسٹڈیز

پارلیمان یا پارلیمنٹ یا قانون ساز ایوان، ایک ایوان ہوتا ہے جہاں پر قانون سازی کی جاتی ہے۔ پارلیمان تمام تر جمہوری ممالک میں ہوتے ہیں۔ یہ بحث اور مباحثے کی جگہ ہوتا ہے۔ پارلیمان میں ملکی مسائل سے بحث ہوتی ہے اور پھر یہاں سے مسائل کے حل کے لئے اقدامات اٹھائے جاتے ہیں اور قانون بنائے جاتے ہیں۔ (مرتب)

جمہوریت میں پارلیمنٹ کا کردار

جمہوریت میں پارلیمنٹ کا کردار کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے میں انسانی دماغ کو بطور مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ خالق نے انسانی دماغ کی تخلیق سوچنے اور سمجھنے کے لئے کی ہے۔ دماغ انسانی جسم کی ضرورتوں کا دیکھ بھال کرتا ہے، جسم میں جہاں کہی کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے، دماغ حرکت میں آتا ہے۔ نروس سسٹم جسے کمیونیکیشن سسٹم بھی کہہ سکتے ہے کو پیغام دیتا ہے کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔ نروس سسٹم یہ حکم مطلوبہ اعضاء تک ٹرانسفر کرتا ہے۔ یوں جسم کو مطلوب وہ چیز میسر آجاتا ہے۔

میری نظر میں پارلیمنٹ جمہوری نظام میں دماغ کی طرح ہے۔ پارلیمنٹ سوچتی ہے کہ کس کو کیا کرنا چاہیے؟ کون کہاں ہونا چاہیے؟ لوگوں کو کس قسم کی زندگی گزارنی چاہئے؟ اس کے لیے ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟ سوچ بچار کے بعد پارلیمنٹ انتظامیہ کو حکم دیتا ہے اور وہ اس سوچ پر عمل درآمد کروا دیتا ہے۔

ہماری بدقسمتی

ہماری قوم کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارا دماغ بہت عرصہ غائب رہا۔ ۱۹۵۸ء سے

لے کر ۱۹۶۲ء تک، ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک، ۱۹۷۷ سے لے کر ۱۹۸۵ تک اور پھر ۱۹۹۹ سے لے کر ۲۰۰۲ تک پارلیمنٹ ہی نہیں تھی۔ گویا جسم تو تھا مگر دماغ نہیں تھا۔ اب جب دماغ نہیں ہوگا تو نظام کیسے چلے گا۔؟

پارلیمنٹ کا ارتقاء

پارلیمنٹ انگریزوں کی ایجاد ہے، مگر ہمارے معاشرے میں پہلے سے ایسے ہی ادارے موجود تھے جہاں معتبر سردار بیٹھ کر مسائل حل کرتے تھے، اس کو جرگہ یا پنچایت کہا جاتا تھا۔ پارلیمنٹ بھی ایک جرگہ یا پنچایت ہی ہے، مگر انگریز دور میں اس کے لئے کچھ اصول اور طریقہ کار وضع کئے گئے۔ علامہ اقبال کی ایک خطبہ ہے جو آپ نے خلافت عثمانیہ کے بحران کے وقت دیا تھا۔ اس خطبہ میں وہ فرماتے ہیں: کہ ہمارے لئے بلکہ آنے والے وقتوں میں ہر کسی کیلئے عوامی ماڈل (Republican model) یعنی ایک ایسی ریاست جسمیں میں عوام سب سے بڑھ کر ہو، ہی فائدہ مند ہوگا۔

منتخب نمائندوں کی ضرورت اور کردار

جمہوریت عوامی حکومت کو کہتے ہے۔ ہر مسئلے میں ہر ایک شخص سے رائے لینا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے لئے عوامی نمائندوں کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ہر حلقے کے لوگ اپنا ایک نمائندہ منتخب کریں جو ایوان میں ان کی نمائندگی کرے۔

اسلام نے جو شوری کا تصور دیا ہے وہ جمہوریت ہی کی ایک شکل تھی۔ اس دور میں چونکہ آبادی بہت کم تھی اس وجہ سے سب سے مشورہ ممکن تھا۔ جمہوریت کا ارتقاء جس عہد میں ہوا۔ اس عہد میں بھی آبادی بہت کم تھی۔ لوگ اکھٹے ہو جاتے اور کب کیا کرنا ہے؟ سب باہم مشاورت سے طے کر لیتے۔ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی۔ ہر ایک سے رائے لینا مشکل سے مشکل تر ہونے لگا، ایک وقت آیا کہ عوام کا صبر جواب دے گئی۔ انہیں عدم نمائندگی کا احساس بے چین کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انہیں سڑکوں پر باہر نکلنا پڑا۔

اب عوامی نمائندوں کا مرحلہ آیا۔ ایک علاقے سے ایک شخص کو منتخب کیا جاتا ہے

جو کہ اس پورے علاقے کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔علاقے کی ضروریات کیا ہے؟ مسائل کیا ہے؟ حکومت کیا کچھ کر سکتی ہے؟ سب اسی کے زبانی معلوم ہوا کریں گی۔

ایک حلقہ میں تین تین نمائندے ہوتے ہیں۔مقامی سطح کی،صوبائی سطح کی اور ملکی سطح کی۔ان تینوں نوع کی نمائندوں کو ملا کر کتنی تعداد کتنی بنتی ہے؟ کارکردگی جاننے سے قبل اس کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔قومی اسمبلی کے کل ۳۴۲ آراکین ہیں اور پورا پاکستان انہوں نے کنٹرول کیا ہوا ہے۔سینٹ میں کل ۱۰۴ نشستیں ہوتی کل ملا کر ۴۴۹ ممبرز ہوگئے۔ پنجاب کی اسمبلی سب سے بڑی ہے،اس میں کل ممبرز ۱۷۱ ہے۔دوسرا نمبر سندھ کا ہے کل ممبرز ۱۶۸ ہے۔کے پی کے کل ۱۴۵ اور بلوچستان میں ۶۵ ممبرز ہوتے ہیں۔یہ سارے بارہ صد سے بھی کم ہے۔

آپ ملک کی دوسرے اداروں کو دیکھیں۔ہر جگہ تعداد لاکھوں میں ہے۔صرف یہ ایک ادارہ ہے جہاں ارکان کی تعداد اتنی کم ہے،اس کے علاوہ اس ادارے کے ارکان سب منتخب ہوکر آئے ہوئے ہوتے ہے۔مقابلہ جیتا ہے۔ایک افسر اگر غلط چنا جاتا ہے تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن اگر ایک نمائندہ کھرا اور سچا نہ ہوا تو پانچ سال بعد آپ اس کو گھر بٹھا سکتے ہو۔ملک کے اکثر مسائل اس وجہ سے ہے کہ لوگوں تک نمائندوں کی رسائی نہیں ہو پارہی۔ہمیں اگر اپنے سسٹم کو ٹھیک کرنا ہے تو منتخب نمائندوں کی تعداد کو بڑھانا ہوگا،تاکہ ملک کے ہر شہری تک رسائی ہو،ہر کسی کی بات سنی جائے،شکایت کیا ہے؟اور ازالہ کیسے ممکن ہوگا؟ پر غور وفکر کیا جائے۔

پاکستان کا جمہوری ورثہ

ڈاکٹر سلطان محمود صاحب
پاکستان سٹڈی سنٹر،ہزارہ یونیورسٹی کے پی کے

موجودہ جمہوری سیٹ اپ اور برطانوی سامراج

پاکستان کے جمہوری ورثہ سے بحث کرنے سے قبل ہم اس موضوع پر بات کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ کا جاننا بہت ضروری ہے۔اس کے لئے میں اپنے استاد ڈاکٹر محمد وسیم صاحب کے الفاظ نقل کرنا چاہوں گا۔وہ لکھتے ہیں: پاکستان کے انتخابی سیاست کو آج جتنے مسائل کا سامنا ہے ۔ان سب ان کی جڑ اس جمہوری سیٹ اپ میں ہے جس کو برطانوی سامراج نے متعارف کیا ہوا ہے۔تاریخ شاہد ہے انگریز سے قبل ہندوستان میں جمہوریت کا کوئی وجود نہیں تھا۔انگریز نے یہاں نیم پختہ جمہوریت متعارف کرائی۔ پاکستان جب وجود میں آیا تو ہمارے پاس پہلے سے ایک سیٹ اپ موجود تھا۔پارلیمنٹ، انتخابی ادارے،الیکشن کا طریقہ کاراور ووٹنگ کا ایک سسٹم موجود تھا۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا برٹش امپائر یہاں کی حکومت پر قبضہ کرنے آئی تھی۔انہوں نے جمہوری سسٹم کیونکر متعارف کروایا؟ایسا کیوں ہوا؟ہم نے اس کا جائزہ لینا ہے۔

مجموعی طور پر اگر دیکھ لیا جائے تو برطانیہ میں مکمل طور پر جمہوریت تھی۔وہ جمہوریت کو اپنے مسیحا کے طور پر جانتے تھے مگر ہندوستان میں جو انہوں نے جمہوریت متعارف کرائی وہ خالص اور مکمل نہیں تھی۔یہاں پر مکمل جمہوریت کا قیام ان کے فائدے میں نہیں تھا۔وہ قبضہ کرکے آئے تھے،جمہوریت کا مطلب تو یہ ہوتا کہ اکثریت جس کو چاہے حاکم بناسکتے ہیں۔وہ اگر آزادانہ الیکشن کرواتے تو سب سے پہلا نعرہ یہ لگتا۔آپ لوگ یہاں سے چلیں جائیں ہم خود اپنے حکمران چن لینگے۔

مگر یہ تو وہ چاہتے ہی نہیں تھے۔آپ سب کومعلوم ہے۔انگریز ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئے تھے۔یہ کمپنی جہانگیر کی عہد حکومت میں تجارت کرنے آئی ۔کاروبار میں ترقی ہوئی تو ان لوگوں نے ادھر ادھر پر مارنا شروع کئے۔ویسے بھی مسلمانوں میں مرکزیت کا فقدان تھا۔سلطان عالمگیر کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہوتی چلی گئی۔یہاں تک کہ ہندوستان کئی ریاستوں میں تقسیم ہوکر رہ گیا۔شاہجہان کے عہد میں تو شاہی فرمانروا شاہی قلعے تک محدود ہوئے۔ان کا مرکزی حکومت کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔

یہ ہمارے پولیٹیکل مسائل تھے۔جس نے انگریزوں کو یہاں کے سیاست میں دخل اندازی کی دعوت دی۔اس کے علاوہ ایک سبب یہ ہوا۔اس عرصے میں بہت سی فیکٹریاں کھلے۔کارخانوں میں جو مٹیریل استعمال ہوتا تھا۔وہ سب کے سب انگلینڈ میں نہیں ہوتا تھا۔انہوں اس کے لئے مٹیریل دنیا بھر سے تلاش کرنا چاہا۔انڈسٹری کے لئے مارکیٹ کی بھی ضرورت تھی۔وہ چاہتے تھے انڈسٹری کے لئے مٹیریل فری میں یا پھر کم سے کم قیمت میں حاصل ہو۔اور مارکیٹ میں مہنگا سے مہنگا بکیں۔

یہ چند مقاصد تھے جسے وہ لوگ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔یہ طاقت کے محتاج تھے اور طاقت حکومت کی۔سو انہوں حکومت میں دخل دینا شروع کیا۔کچھ لوگ باہر سے بلائیں گئے جبکہ چند ایک افراد مقامی لئے گئے۔یوں برٹش انڈین آرمی کی بنیاد پڑی۔ہمارے آرمی کے بہت سارے یونٹ اسی وقت سے ہے۔

اس آرمی نے بہت سارے چھوٹے چھوٹے ریاستوں سے ساز باز کی۔ نوابوں، راجہ اور مہاراجوں سے بات کی گئی۔ان سے کہا گیا۔آپ کی نوابی برقرار رہے گی آپ بس برٹش آرمی کی حمایت کیجئے۔ہم آپ کی دفاع اور معیشت کے ضامن ہیں۔آپ ہماری حمایت کرکے عیش کی زندگی جیئے۔

اکثریت یہ بات مان چکی تھی۔چند ایک نے انکار کیا تو ان سے جنگیں ہوئیں۔ سراج الدولہ اور پھر ٹیپو سلطان مارے گئے۔ٹیپو سلطان کے بعد کوئی بڑی بغاوت نہیں اٹھ

سکی۔ایسٹ انڈیا کمپنی آہستہ آہستہ ملک پر قبضہ کررہی تھی۔لوگوں میں بھی آہستہ آہستہ نفرت پیدا ہوتی گئی۔اس نفرت نے بلآخر ۱۸۵۷ء کی تحریک جنگ آزادی کی صورت اختیار کی۔بہت بڑا طبقہ اس جنگ کو جنگ آزادی کا نام دیتا ہے جبکہ سرسید احمد خان اور ان جیسے بہت سارے حضرات اس کو غدر کا نام دیتے ہیں۔جنگ مسلمانوں کی شکست پر منتج ہوئی۔شکست کی بڑی وجہ فوج کے درمیان رابطہ کا فقدان تھا۔جب لڑنے والے سپاہیوں میں رابطہ ہی نہیں ہوتو شکست یقینی ہوجاتی ہے

شکست کے بعد سرسید نے بغاوت کے اسباب پر ایک کتاب لکھی۔اس میں لکھا آپ لوگوں نے یہاں کے لوگوں کو ایک قسم کی قید میں رکھا ہے۔لوگوں کی کوئی نمائیندگی نہیں ہے۔لوگوں کو نمائندگی دیجئے تو لوگوں کی دلوں میں نفرت اور بغاوت کے جزبات مانند ہوسکتے ہیں۔سرسید کی رائے پر عمل کرنے کا مشورہ ہوا اورایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کے زریعے ہندوستان پر حکومت کا منصوبہ بنایا۔اس زمانے میں کئی سکول،کالجز اور یونیورسٹیاں بنائی گئی۔ان میں لوگوں کوتعلیم دیا جاتا۔وہ زیادہ پڑھتے نہیں تھے۔انہیں ڈاکٹر یاانجنیئر بننے کا شوق نہیں ہوتا تھا اور نہ وہ اس کیلئے تعلیم حاصل کر رہے ہوتے تھے بلکہ وہ تو لیڈر تھے انہیں سیاست یا بیوروکریسی کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔
اس کا خلاصہ یہ بنتا ہے۔انگریز جنگ آزادی کے بعد جب اپنے نظام پرغور کیا۔تو انہیں اسی میں عافیت محسوس ہوئی۔منظوری دی گئی۔ہندوستان کی حکومت کمپنی سے شاہ برطانیہ کو منتقل ہوئی۔

ہندوستانیوں کی حکومت میں شمولیت

ہندوستانیوں کو چار مراحل میں حکومت میں شامل کیا گیا۔یہ چار آئینی فارمولے ہے۔

☆ ۱۸۶۱ء

☆ ۱۹۰۹ء

☆ ۱۹۱۹ء

☆ ۱۹۳۵ء

۱۸۶۱ء کے آئینی فارمولے کے تحت مجلس قانون ساز میں وسعت لائی گئی۔اب یہ ترمیم لائی گئی کہ مجلس قانون ساز کے آدھے افراد غیر سرکاری ہونگے،یہ غیر سرکاری افراد لینے کی ترمیم سے قبل اس مجلس کے پورے ارکان برطانوی شہری تھے۔اس ترمیم میں جو آدھے افراد لئے جاتے وہ افراد بھی منتخب ہوکرنہیں آتے تھے بلکہ انہیں برطانوی سامراج سلیکٹ کرتے لیکن پھربھی یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستانیوں کونمائندگی مل گئی
اس کے بعد۱۸۹۲ء ایکٹ آتا ہے۔اس میں مجلس دستور ساز کے نمائندوں کو بڑھایا گیا۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی اختیارات میں بھی اضافہ کیا گیا۔خالد بن سعید کا نام اگر آپ لوگوں نے سنا ہو۔انہوں نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے۔کئی کتابیں پبلش ہوچکی ہیں۔وہ اسے وائسرائے لیگل سسٹم کہتے ہیں۔
اس سسٹم میں چند بنیادی عہدیدار ہوتے تھے۔

☆ کمانڈنگ وائسرائے

☆ ایگزیکٹیوکونسل

ایگزیکٹیوکونسل کے ارکان کوکورنر جنرل منتخب کرتے تھے۔

☆ سنٹرل اسمبلی

یہ اسمبلی موجود تو تھی مگر اس کی اختیارات بہت محدود تھے۔

☆ پرویشنل گورنمنٹ

اس سسٹم میں موجود ان سبھی اداروں کوکوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا تھا بلکہ طاقت کا اصل مرکز بیوروکریسی ہوتی تھی۔تین سطح پر بیوروکریسی موجود تھی۔

☆ ملکی سطح پر

☆ صوبائی سطح پر

☆ اورضلعی سطح پر

اس سسٹم میں سب سے زیادہ اختیارات ڈپٹی کمشنر کے پاس ہوتے،عوام کوقرض

دینا،لوگوں سے معاملات،قیدوبند کی سزائیں اور ترقیاتی کام سب ڈی سی ہی کرتے تھے۔

اس کے بعد ۱۹۱۹ء ایکٹ پاس ہوا۔اس سے بہت دلچسپ قسم کی سیٹ اپ تیار ہوا۔ اردو میں ہم اس کو دوعملی کہہ سکتے ہیں۔صوبوں میں دوقسم کی وزراء ہوتے تھے۔ آدھے ارکان کو گورنر براہ راست منتخب کرتا جبکہ آدھے الیکشن لڑکر منتخب ہوتے تھے۔ووٹ کا حق بھی سب صرف کچھ منظور نظر خاندانوں کو ہوتا تھا۔

اب لگ تو یہ رہا تھا کہ ایک بہتر باڈی تشکیل پا چکی ہے۔مگر یہ سسٹم زیادہ دیر چل نہ پائی۔اس سسٹم میں بازپرس کا نظام ناقص تھا۔مثلا ایک وزیر کو زراعت کا محکمہ سونپا گیا تھا۔وہ عوام کا نمائندہ اور عوام کو جواب دہ تھا۔تو آبپاشی کا محکمہ اس وزیر کے دست تصرف میں ہوتا تھا جو گورنر جنرل کا منتخب کردہ تھا۔اب زراعت بغیر پانی کے کیسے چلے گا۔یہ دورنگی زیادہ دیرنہیں چلی۔

اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں ایک اور ایکٹ لایا گیا۔اس ایکٹ سے صوبوں میں باختیار حکومتیں بن گئی۔لیکن مرکز میں معاملات جوں کے توں رہے۔ووٹ دہندوں کی تعداد پانچ ہزار سے بڑا کر ۵ ملین کردی گئی۔لیکن مجموعی حیثیت سے اگر دیکھ لی جائے تو ملک کے ۱۱ فیصد آبادی کو ووٹ کا حق دیا گیا۔

یہ نظام قدرے بہتر نظام تھا۔اس میں اگر چہ اختیارات اب بھی حکومت برطانیہ کے پاس ہوتے تھے۔مگر پھر بھی جمہوریت کی ایک بہتر اور معقول نظام وجود میں آیا جو بعد میں ہمیں ورثے میں ملا۔

پاکستان اسلامائزیشن کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر اکرام الحق یاسین

سیکرٹری جنرل اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

ہندوستان پر برٹش امپائر کے قابض ہونے سے قبل اسلامی قوانین نافذ تھے،عدالتوں میں فیصلے فقہ حنفی کے روشنی میں کئے جاتے تھے۔برطانوی سامراج قابض ہوا تو کچھ عرصہ کے لئے انہیں بھی سابقہ نظام جوں کے توں رکھنا پڑا،بعد میں بدلاو در بدلاو کرتے ہوئے اپنے نظام اور اپنے قوانین رائج کئے۔

آزادی کی تحریک میں مسلمانان ہند نے تقسیم ہندوستان کا نعرہ ایک ایسی ریاست کی تشکیل کے لئے لگایا تھا جس میں شرعی نظام نافذ ہو اور مسلمانوں کے فیصلے ان کی مذہب کی روشنی میں ہوا کریں۔اس عرض سے علامہ اقبال اور بعد کے ادوار میں مختلف حکمرانوں نے کمیٹیاں تشکیل دیئے جس نے بعد میں جا کر اسلامی نظریاتی کونسل کی صورت اختیار کی۔(مرتب)

پاکستان کی نظریاتی حیثیت

ملک خدادا پاکستان علامہ اقبال رح کی فکر کا نتیجہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے دوران ہی یہ بات طے ہوچکی تھی کہ پاکستان کا نظام اقبال رح کے سوچ کا مظہر ہوگا۔آئیئے ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کا ذہن میں جدید اسلامی ریاست کا کیا ماڈل تھا اور وہ کس نوعیت کے اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کے خواہش مند تھے۔

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کا تصور اسلامی ریاست بیک وقت روایتی ماخذ پر مبنی بھی ہے اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی۔

علامہ اقبال نے ریاست کی بنیاد روحانی جمہوریت جس کو ہم مذہبی جمہوریت یا

اسلامک جمہوریت بھی کہہ سکتے ہیں پر رکھی ہے۔مگر انہوں نے روحانی جمہوریت کی کوئی تعریف کی نہیں ہے۔علامہ صاحب نے تقسیم ہندوستان اور ایک جدید اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا تو ساتھ چودہ نکاتی خطبہ آلہ آباد میں اس ریاست کے لئے اجتہاد پر زور دیا ہے اور اجتہاد کرنے کے لئے انہوں نے جس ادارے کو تجویز کیا ہے، اس کا نام مسلم پارلیمان رکھا ہے۔یعنی مسلمان نمائندے مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں مل بیٹھ کر اجتہاد کریں گے۔اس خطبہ میں وہ مزید کہتے ہیں کہ ہم یورپی تجربات سے فائدہ اٹھائیں گے۔پارلیمان کا سٹرکچر یورپ سے لیں گے،البتہ مطلق العنان قانون سازی کا حق عوامی نمائندوں کو نہیں دینگے بلکہ ہمارا آئین اسلام کے ماتحت اور شریعت کے عین مطابق ہوگا۔

یاد رہے علامہ اقبال کی سوچ کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ پارلیمان جیسا بھی ہو انہیں ہم اجتہاد کا حق دینگے بلکہ ان کا مدعی یہ ہے کہ ہم پارلیمان کو اس قدر بہتر بنانے کی کوشش کرینگے جن میں مسلمانون کے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو۔مذہبی رہنمائی کے لئے علماء ہو،قانونی رہنمائی کے لئے وکلاء حضرات ہو جبکہ عوامی مسائل کیا ہے؟حل کیسے ہوں گے؟اس کے لئے عوامی نمائندے ہو۔سب کا آپس میں ڈسکشن ہو،یہاں تک کہ سب کسی ایک قانون پر متفق ہو جائے۔اس طرح جو قوانین بنیں گے وہ شریعت کے بھی موافق ہوں گے جبکہ جدید عہد کے جدید تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہوں گے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایران میں شوری نگہبان موجود ہیں وہاں جو قانون سازی ہوتی ہے وہ شوری نگہبان کرتی ہے۔پارلیمان میں قانون سازی کے لئے درخواست دی جائے تو وہ شوری نگہبان کے سامنے پیش ہوتا ہے۔اگر مذکورہ قانون شوری نگہبان کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوجائے تب ہی وہ قانون لاگو ہوتا ہے،بصورت دیگر رد کردیا جاتا ہے۔کیا علامہ اقبال کے کے تصور پارلیمان میں اس قسم ادارے کا وجود موجود ہے کہ نہیں؟

علامہ اقبال رحمہ اللہ اس نوعیت کے اداروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں،مگر سنی

اکثریتی ملک میں اس نوع کے ادارے خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر انہوں نے یہی تجویز کیا کہ خود پارلیمان اس لیول کا ہونا چاہئے جو اجتہاد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔لیکن وقتی طور پر یا ادارہ ایسا ہو جو سپریم اٹارٹی نہ ہو یہاں بھی مفید ہے۔

علامہ اقبال کی تجویز

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں علامہ اقبال رحمہ اللہ نے پاکستان کا تصور پیش کیا اس کے بعد آل انڈیا مسلم کانفرنس کا جلسہ ہوا اس جلسے کی صدارت علامہ اقبال کر رہے تھے اس میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک ایسے ادارے کی تجویز پیش کی، جو علما اور وکلا پر مشتمل ہو اور مسلمانوں کے لئے قانون سازی سے پہلے اس ادارے سے منظور ہوا کرے۔انہوں نے بنفس نفیس بھی ایسے ادارے کے لیے کوششیں کیں، ان کا ایک دوست تھا چودھری نیاز علی خان۔ یہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے۔ان کی سو ایکڑ زمین تھی۔اس میں انہوں نے تقریبا ساٹھ ایکڑ پر دارالاسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔اس ادارے کی سربراہی کے لئے علامہ اقبال نے شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ صاحب کو خط لکھا کہ ہمیں ایک ایسے شخصیت کی ضرورت ہے جو اسلامی شریعت اور جدید علوم پر یکساں عبور رکھتا ہو، مگر انہوں نے یہ کہتے ہوئے معذرت کی کہ میرے پاس ایسا کوئی عالم فی الحال موجود نہیں ہے۔

علامہ اقبال کے بنائے ہوئے اس کونسل میں بڑے بڑے لوگ آئے۔جس میں علامہ مودودی ،علامہ اسد، علامہ احمد پرویز وغیرہ شامل ہیں۔پاکستان بننے تک تو یہ ادارہ قائم رہا۔ پاکستان بننے کے بعد چودھری نیاز علی خان پاکستان تشریف لے آئے اور جوہرآباد میں اس ادارے کی بنیاد رکھی۔ بہت عرصہ تک اس ادارے نے خدمات سرانجام دی ہے۔انڈیا والے ادارے کا کیا ہوا؟اس کا کچھ خیر خبر معلوم نہیں ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اسلامائزیشن

پاکستان بننے کے بعد لاہور میں ایک ادارہ پنجاب گورنمنٹ نے قائم کیا۔علامہ

محمد اسد اس ادارے کے ڈائریکٹر بنائے گئے۔یہ ادارہ اگرچہ پنجاب حکومت کی ماتحت تھا مگر علامہ اسد نے جو سفارشات مرتب کئے وہ انہوں نے مرکزی حکومت کو ارسال کئے۔ جس میں صاف صاف اور بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا تھا کہ اس ملک میں اسلام کیوں نافذ نہیں ہو رہا اور ہمیں نفاذ اسلام کے لئے کیا کیا کرنا چاہئے۔

کچھ سفارشات ملاحظہ ہو

- ☆ قوانین اور معاشرے کی تعمیر نو
- ☆ قوانین اور معیشت کی تعمیر نو
- ☆ تعلیم
- ☆ اخلاقیات
- ☆ عمومی دعوت

کچھ عرصہ بعد ان کی ٹرانسفر وزارت خارجہ میں کر دی گئی سعودیہ اور عرب ممالک کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے انہوں نے ان ممالک میں پاکستان کے سفارت خانے کھلوانے میں مدد کی۔ علامہ اسد آسٹریا کے رہنے والے تھے، پہلے یہودی تھی، بعد مسلمان ہو گئے تھے۔

اس کے بعد ایک دوسرا ادارہ بنایا گیا۔اس کمیٹی کے ذمہ یہ لگایا گیا ہے کہ آپ پاکستانی دستور کے لیے اصول وضع کریں مگر شرط یہ ہوگی کہ اصول قرارداد مقاصد کے دائرے کے اندر ہوں گے۔اس کمیٹی کے مدد کے لئے ایک ادارہ بنایا گیا جس کا نام بورڈ آف تعلیمات اسلامی رکھا گیا۔اس ادارے کی سربراہی کے لیے علامہ سید سلمان ندوی صاحب رح کو دعوت دی گئی۔لیکن قبل اس کے کہ وہ پاکستان ہجرت کرتے،اس ادارے نے کام شروع کر دیا۔مفتی محمد شفیع صاحب (بانی دارالعلوم کراچی) بھی اس ادارے میں وابستہ تھے۔ڈاکٹر محمد حمیداللہ کو بھی بلوایا گیا،لیکن ڈاکٹر صاحب کا تو اپنا ایک الگ انداز تھا کہ فوری طور پر کام شروع کیا جائے اور وہ کام موثر بھی ہو۔

بدقسمتی سے یہاں کام کی رفتار انتہائی سست تھی۔اس وجہ سے ڈاکٹر صاحب

ناراض ہوکر واپس چلے گئے ۔اس کے بعد اس ادارے کی ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ جو کام کرتی رہی۔

مجلس دستورساز میں پیش ہونے والے رپورٹ پر اعتراضات

سید سلمان ندوی صاحب تقریبا ۱۹۵۰ء کے بعد تشریف لائے ۔تب تک ایک رپورٹ بھی شائع ہوکر مجلس دستورساز میں پیش ہو چکی تھی۔ اس رپورٹ پر بہت سارے اعتراضات ہوئے تھے۔ بنگالیوں کو شکوہ تھا کہ رپورٹ میں اردو کو سرکاری زبان قرار دی گئی ہے جبکہ اکثریت ہماری ہے۔

ان کی دوسرے شکایت یہ تھی کہ آپ نے کراچی کو دارالخلافہ قرار دیا ہے جبکہ ہم نے بھی قربانیاں دی ہیں ۔ڈھاکہ کو ہی مرکزی شہر ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ رپورٹ میں اسلام کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے،اس سے تو ملائیت آجائے گی۔ دینی طبقات کو یہ اعتراض تھا کہ بورڈ کمیٹی بنا دی گئی ہے۔اب ان کی جو مرضی ہوگی دین کو اس طرف لے کر جائیں گے۔

ان اعتراضات کی وجہ سے وزیراعظم جناب لیاقت علی خان صاحب نے اس رپورٹ کو اخبارات میں شائع کرنے کا حکم دیا۔عوام سے کہا گیا،جن کا کوئی اعتراض ہو وہ اپنے اعتراض پینل کو ارسال کریں ۔اس کے بعد ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جن کے ذمہ ان اعتراضات کا جائزہ لینا تھا۔ اس کے ساتھ لوگوں سے رائے طلب کی گئی کہ آپ کس طرح کا دستور چاہتے ہیں۔آپ ہمیں خطوط کے ذریعہ آگاہ کریں۔

کہا جاتا ہے کہ اتنے خطوط آئے کہ انبار لگ گئے۔ اس کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی انہوں نے ڈیٹا کی کی چھان بین کی،مشترکہ سفارشات کو الگ کیا۔۹۰ فیصد سے زائد لوگ اسلامی نظام کے حق میں تھے۔

سید سلیمان ندوی کی وزیراعظم سے اپیل

سید سلیمان ندوی صاحب جب پاکستان آئے تو حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ ہر

بات کی جائزہ لینے کے بعد انہوں نے وزیراعظم صاحب سے سفارش کی کہ آپ آئین کی اسلامائزیشن کی بات تو کر رہے ہو لیکن قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈالنے کے بات نہیں کر رہے ، میں اس ادارے کی سربراہی تب قبول کروں گا جب اس اسلامائزیشن کے ساتھ ساتھ ساتھ قانون کی اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی رضامندی اختیار کرو گے۔

قائد ملت خان لیاقت علی خان نے ان سفارشات پر ایک کمیٹی تشکیل دی۔اس کمیٹی کے ذمہ لگایا گیا کہ انگریز سے جو قوانین وراثت میں ملے ہیں ان کو کس طرح اسلامائز کیا جائے۔ ۱۹۵۶ء کا دستور بنایا گیا جس میں یہ سفارش کی گئی۔ ایک اسلامی کمیشن بنایا جائے گا جس کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ موجودہ قوانین کو اسلامائز کرنے کے لئے سفارشات مرتب کرے۔ یہ اسلامک کمیشن بن تو گئی مگر حکومت اس کمیشن کی سفارشات کیساتھ کتنی مخلص تھی اس کا اندازا آپ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں۔مفتی عبدالشکور صاحب کہہ رہے تھے کہ میں نے مولانا ظفر احمد عثمانی رح جو کہ اس کمیشن کے ممبر تھے سے پوچھا حضرت آپ جو یہ کوشش کر رہے ہیں۔ کیا حکومت اس کام میں مخلص ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے نہیں لگتا۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت سنجیدہ نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ حضرت پھر آپ وقت ضائع نہیں کر رہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں! ہم وقت ضائع نہیں کر رہے۔ ہم صرف اپنا کام کر رہے ہیں ،اگر بعد میں کوئی قوانین کو اسلامی کرنا چاہے تو ہم ان کو بتا چکے ہوں کہ یہ قوانین کس طرح اسلامی ہو سکے گی اور کس طرح اس کے لئے جدوجہد کی جاسکتی ہے،ہم نے کوشش کی کہ اس کمیشن نے جو کام کیا ہے وہ ہمیں مل جائے مگر کوشش بسیار کے باوجود صرف دو نوٹیفیکیشن ہی مل سکے۔ پہلا نوٹیفیکیشن جو تھا وہ کمیشن ختم کرنے کا تھا دوسرا کمیشن کے ممبران کے تقرر کا تھا۔

۱۹۶۲ء کے آئین شک نمبر ۲۰۴ کے تحت ایک ادارہ تشکیل دیا گیا جو ملک وقوم کی مذہبی راہنمائی اور قوانین کو اسلامائز کرنے میں کردار ادا کرے۔اس ادارے کا نام ''اسلامی مشاورتی کونسل رکھا گیا۔۱۹۷۳ء کے آئین میں اس کا نام تبدیل کر کے اسلامی نظریاتی کونسل رکھا گیا۔

مذہبی خطوط پر استخلاص وطن کی تحریک

اسلامی نظریاتی کونسل قیام تعارف اور اسلامائزیشن میں کردار

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

مذہبی خطوط پر استخلاص وطن کی تحریک

تحریک آزادی پاک و ہند کی غیر جانبدارانہ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتیں اصلا آزادی یا تقسیم پاک و ہند کے عرض سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ دونوں جماعتوں کا ابتدائی بیانیہ انگریز سامراج کی ماتحت رہ کر اپنے اپنے متعلق افراد کے لئے آئینی اور جمہوری حقوق کا حصول یقینی بنانا تھی۔

ہندوستان میں جمعیت علماء ہند ہی ایک ایسی جماعت تھی جو کہ ابتداء سے ہی استخلاص وطن پر یقین رکھتی تھی۔انگریز سامراج سے آزادی کے لئے اس فکر نے بہت جدوجہد کی ہے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی،اس سے قبل کی مسلح جدوجہدیں اور تحریک ریشمی رومال۔یہ چند دنوں کا قصہ نہیں ہے بلکہ ایک صدی کی بات ہے۔

جمہوری فکر کی ترویج

برٹش امپائر سے آزادی کے لئے جو قوتیں برسر پیکار تھی وہ جمہوری سوچ وفکر کی حامل نہ تھی۔جو جماعتیں جمہوری نظریہ رکھتی تھی وہ آزادی کے لئے کوشش نہیں کر رہی تھی۔یہی وجہ تھی کہ بہت عرصہ جدوجہد کر کے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔تحریک ریشمی رومال کی ناکامی کے بعد آزادی کی چاہ رکھنے والوں میں جمہوری سوچ کی ترویج شروع ہوئی۔جمعیت علماء،مسلم لیگ اور کانگریس یہ تینوں ملک کی غالب اکثریت تھی،تینوں کی سوچ وفکر جمہوری تھی اور سب استخلاص وطن کے نظریہ پر متفق ہوگئے،سوانگریز سامراج کو بھی یہاں سے جانا پڑا۔

مذہبی فکر کی تقسیم

استخلاص وطن کی منظور ہوتے ہی مسلم لیگ کی طرف سے تقسیم ہند کا نظریہ پیش کیا گیا۔ یہ دوقومی نظریہ تھا۔ دوقومی نظریہ خالص مذہبی خطوط پر استوار ہے۔ اب ہماری دینی ذہن تقسیم ہوگئی۔ ایک گروہ تقسیم ہندوستان کا حامی اور دوسرا گروہ سخت مخالف تھا، جو مخالفت کررہے تھے ان کے سامنے ایک ماڈل تھا کہ ہم مسلمان اور ہندووں کو دو مذاہب کو اکثریت اور باقی مذاہب کو اقلیت ڈکلیر کرکے یونائیٹڈ سٹیٹ کی شکل میں رہ لیں گے۔ کانگریس بھی اس تجویز پر متفق ہوگئی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

تقسیم ہندوستان کی حمایت کرنے والوں کا کہنا تھا کہ مسلمان ایک تہذیب و تمدن اور جداگانہ سوچ رکھتے ہیں۔ ہماری شریعت الگ ہے۔ ہم ہندووں کے ساتھ کس طرح رہ پائیں گے۔ روز روز کے مسائل سے بہتر یہی ہے کہ ابھی سے کوئی فیصلہ ہوجائے۔ ہمیں ایک علیحدہ ریاست ملے۔ جہاں پر قرآن وسنت کا نظام رائج ہو۔ قائد اعظم رح نے بھی پاکستان کو شریعت کے لئے ایک تجربہ گاہ کہا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد

قیام پاکستان خالص مذہبی نظریہ سے وجود میں آیا تھا اور قائدین تحریک نے عوام کو یہی باور کرایا تھا، قیام کے بعد وہ علماء کرام جنہوں نے بہت محنت کی تھی جن میں عثمانی گروہ (علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ ظفر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع رحمہم اللہ وغیرہم حضرات) سرفہرست ہے اور کچھ وہ بڑے بڑے جو تقسیم ہندوستان کے تو مخالف تھے مگر اسلامی ریاست کے تشکیل کے بعد یہاں ہجرت کرگئے تھے جن میں مولانا مودودی وغیرہ شامل ہے۔

ان حضرات نے کبھی بھی قیام پاکستان کے مقصد کو محو نہ ہونے دیا۔ قوم کو وقتا بوقتا یاد دہانی کرتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۶۲ء کے آئین اور بعد میں ۱۹۷۳ء کے آئین شک نمبر ۲۲۷ کے رو سے یہ منظور کیا گیا کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنے گا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام اور ذمہ داری

پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنے گا۔ اس کا باقاعدہ نظام وضع کرنے کی عرض سے اسی آئین میں دفعہ نمبر ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے ۲۰ رکنی ادارہ تشکیل دیا گیا جس کا مقصد صدر، گورنر یا پھر اسمبلی کی اکثریت کی طرف سے بھیجے جانے والے معاملے کی اسلامی حیثیت کا جائزہ لیکر ۱۵ دنوں کے اندر انہیں اپنی رپورٹ پیش کرنا تھا۔ شق نمبر ۲۲۸ء میں یہ قرار دیا گیا کہ اس کے آراکین میں جہاں تمام فقہی مکاتب فکر کی مساوی نمائندگی ضروری ہوگی۔ وہاں کم از کم چار ارکان ایسے ہوں گے جنہوں نے اسلامی تعلیم وتحقیق میں کم وبیش ۱۵ برس لگائے ہو اور انہیں جمہور پاکستان کی تائید حاصل ہو۔

ذمہ داری

۱۔ قرآن وسنت کے موافق قوانین کی توثیق کرنا۔

۲۔ وفاق وصوبائی اسمبلیوں کو اسلام کے مطابق سفارشات کرنا

۳۔ موجودہ قوانین کا جائزہ لیکر ایسی سفارشات تیار کرنا کہ ملکی قوانین احکام اسلام کے مطابق ہوجائیں۔

۴۔ احکام اسلام کو ایک مناسب شکل میں ترتیب دینا تاکہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں ان پر قانون سازی کرسکیں۔

۱۹۷۳ء کی آئین کی تشکیل نو کے بعد ایک دو قوانین کے علاوہ کوئی قانون غیر اسلامی نہیں ہے۔ سب اسلامائز ہوچکے ہیں۔

۷۳ء کا آئین ایک متفقہ آئین ہے۔ اس پر ملک بھر کے تمام مکاتب فکر کے بڑے بڑے علماء مشائخ اور دانشوروں کا اتفاق رائے ہوا ہے۔ مفتی محمود، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق اور شاہ احمد نورانی رحمہم اللہ وغیرہ حضرات کے اس پر دستخط موجود ہے۔ خان عبد الولی خان، ذوالفقار علی بھٹو، بزنجو جیسے سیکولر لوگوں نے بھی اس پر دستخط کئے ہوئے

ہیں۔میرا ماننا ہے کہ پاکستان میں کوئی سیکولر لابی موجود نہیں ہے کہ سب نے آئین پاکستان پر دستخط کئے ہوئے ہے اور آئین پاکستان جیسے مسودے پر دستخط کر کے کیسے کوئی سیکولر ہوسکتا ہے؟

تحریک افغانستان کے بعد

افغانستان تاریخی اعتبار سے کئی تحاریک کا آماجگاہ رہا ہے۔ستر کے دہائی میں یہاں روسی فوج کا یلغار ہوا۔اس کے جواب میں افغانستان میں انتقام پر مبنی آزادی کی تحریک کا آغاز ہوا۔جنرل ضیاء الحق اس وقت پاکستان کے صدر تھے۔انہوں نے اس مسلح جدوجہد کی مکمل حمایت کا اعلان کیا۔پوری دنیا سے مدد آنی لگی،کسی نے رقم دی تو کسی نے اسلحہ کی فراہمی یقینی بنائی۔یوں سویت یونین (روس) ٹوٹ گیا۔ہمارے کچھ لوگ بھی وہاں موجود تھے۔روس کی شکست کے بعد وہ واپس آ گئے۔نائن الیون ہوا اور امریکہ افغانستان آیا تو اس جہادی سوچ رکھنے والوں نے مطالبہ کیا کہ جس طرح ہم روس کے خلاف لڑے تھے،اب ہمیں امریکہ کے خلاف بھی کمر کس لینا چاہئے۔یہ سوچ اتنا پھیلا کہ ہمارے قبائلی علاقوں میں ان کے بڑے بڑے بنے۔یہاں تک اسلام آباد میں بھی آپ نے اس مظاہر لال مسجد کی صورت میں دیکھے۔لال مسجد تحریک کو دبایا گیا تو لال مسجد بریگیڈ کے نام سے خودکش دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔جس نے رفتہ رفتہ پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لیا۔GHQ پر بھی حملے ہوئے،بڈھ بیر کیمپ پر حملہ ہوا۔جید علماء کرام پر قاتلانہ حملے ہوئے مثلا مولانا حسن جان کو شہید کیا گیا۔بارودی سرنگوں کا جال بچھائے گئے اور کئی ایک اکابر علماء شہید کر دیئے گئے۔

یہ دراصل تکفیر پر مبنی بیانیہ کے نتائج تھے جو کہ پورے ملک پر مسلط تھے۔ان کے بیانیہ سے اختلاف رکھنے والا کافر اور واجب القتل ڈکلیئر کر دیا جاتا۔موت کے اس کھیل کا نقطہ اختتام آرمی پبلک سکول پر حملہ ثابت ہوا۔۱۴۸ بچوں کو تقریبا گاجر مولیوں کی طرح کاٹ لیا گیا۔یہ وہ وقت تھا جب قوم کی ضمیر نے اس سلسلے کو مزید برداشت کرنے سے

انکار کیا اور سب اس کے خلاف متفق ہوگئے۔قوم کی طرف ایکشن کا مطالبہ کیا۔یوں نیشنل ایکشن پلان بنایا گیا اور بڑے پیمانے پر آپریشنز کئے گئے۔ان آپریشنز کے دوران فوج نے یہ محسوس کیا کہ جب پیچھے عوامی حمایت نہ ہو تو لڑنا خاصہ مشکل ہوتا ہے۔عوام اور اہل مذہب کی حمایت حاصل نہ ہو تو آپریشنز کا یہ سلسلہ آگے بڑھانا ممکن نہیں ہوگا۔اس عوامی سپورٹ کا حصول ''پیغام پاکستان'' کی صورت میں حاصل ہوا۔لوگ کہتے ہے اس مسودہ پر ساڑھے چار ہزار علماء،دانشور اور اہل علم کے دستخط ہے مگر میرے خیال میں اس سے زیادہ اہم پانچوں وفاق کے اکابر اور سربراہان کے دستخط سب سے اہم تر ہے۔

پیغام پاکستان ایک بیانیہ ہے جس کو پالیسی بنانے کے لئے اقدامات کئے جارہے ہیں۔اس کا اعلان ۲۰۱۸ء میں ہوا،ممنون حسین صدر اور شاہد خاقان عباسی پاکستان کے وزیراعظم تھے۔اس مسودے کی تیاری،منظوری اور اس کی ابلاغ میں اسلامی نظریاتی کونسل مکمل شریک کار ہے۔امید ہے کہ ہم آگے بڑھیں گے۔

بین الاقوامی قوانین کی اہمیت

جناب احمر بلال صوفی صاحب
ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان

قانون کے بارے میں کچھ چیزیں تو آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے۔ میں بھی اپنی مختصر لیکچر میں کچھ امور کے متعلق بات کرنے کی کوشش کروں گا۔اس کے بعد سوال جواب کی نشست میں ہم زیادہ وقت لینے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ آپ کے ذہنوں میں موجود سوالات اور آپ کی دلچسپی کے عنوانات پر ہی گفتگو آگے بڑھا سکے۔

بین الاقوامی قوانین اور عہد رسالت

ہمارے ملک کی جغرافیائی ساخت کو دیکھتے ہوئے بین الاقوامی قوانین میں ہماری حساسیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ہم اس نکتہ کو ہمیشہ نظرانداز کردیتے ہیں۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بین الاقوامی قوانین کے پروڈکشن تھے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خرید وفروخت کرتے ہیں تو اس دوران آپ سمپل لفٹ کے پروڈکشن کی رو سے سامنے آتے ہیں۔

ہجرت مدینہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ کے مسودے پر دستخط لئے اور مسلمانوں کے لئے مدینہ میں مرکزی حیثیت متعین کیا۔اسلامی ریاست کی تشکیل کی اور آپ نے اس ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے کئی معاہدے کئے۔ یہ بات طے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاہدوں کی پاسداری کرتے تھے۔ان کا جو رویہ تھا، وہ بہت واضح تھا کہ آپ نے جب بھی کسی سے معاہدہ کیا تو آپ نے پورا کیا چاہے آپ کو اس میں نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ یہ دراصل انٹرنیشنل ایگریمنٹ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے،مسلمانوں کے لئے بین الاقوامی قانون سازی میں بہرصورت کلیدی کردار ادا کرنا چاہئے۔

میں نے چوں کہ کئی دفعہ اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے وزرا اور بین الاقوامی قوانین کے مابین بہت دوری ہے۔ پاکستان کو اس وقت جتنے مسائل کا سامنا ہے، ان مسائل کی نیچر ہی ایسی ہے جس میں ہر مسئلے کا ایک قانونی پہلو ہے۔ ہم نے بدقسمتی سے یا تو اس پہلو سے صرف نظر کیا ہے یا پھر ہم اس پر فوکس ہی نہیں کر رہے۔

سیکشن سوالات

یہ چند گزارشات تھے جس کی وضاحت کرنا میں ضروری سمجھتا تھا۔ اب آپ کی اگر کوئی سوال ہو تو آپ پوچھ سکتے ہیں۔

ہم کشمیر پر جان دینے کیلئے تیار مگر تحقیق کے لئے نہیں

سوال: سر! میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ہم کئی دھائیوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اب یہ تازہ معاملہ جو ہوا ہے کہ ہندوستان نے کشمیر کی آئینی حیثیت بدل دی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم وہاں حملہ تو نہیں کر سکتے۔ لیکن اب عمران خان صاحب اقوام متحدہ جا رہے ہیں ان کے خطاب کی کیا حیثیت ہوگی؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہئے تاکہ ہم اپنے آواز کو بیرونی دنیا تک پہنچا سکیں؟

جواب: کشمیر کے کیس میں بدقسمتی سے ہماری تیاری ہی نہیں تھی۔ ہم کشمیر پر جان دینے کو تو تیار ہیں مگر تحقیق کرنے کو تیار نہیں۔ تقریبا دو سال پہلے اسلام آباد میں ایک سیمینار ہوا تھا۔ اس میں نے کہا تھا کہ آرٹیکل ۳۷۰ کے ساتھ کچھ ہونے جا رہا ہے، ہمیں کان اور آنکھیں کھلی رہ کر اس پر غور کرنا چاہئے۔ میری ساتھ جو تحقیقی کمیٹی کام کر رہی ہے، انہوں نے مجھے بتایا کہ جمون کشمیر کی دو ججمنٹ آئی ہوئی ہیں۔ ہندووں میں کچھ شر پسند گروہوں نے اپیل دائر کی ہوئی تھی کہ شک نمبر ۳۷۰ کو ختم کیا جائے۔ اس درخواست کی سماعت ہوئی اور جموں اینڈ کشمیر ہائی کورٹ کے ججز جس میں ہندو جج بھی شامل تھے نے فیصلہ کیا کہ ہم اس شق کو ختم نہیں کر سکتے۔

اس سے مجھے محسوس ہوا کہ اس کو ختم کرنے کے لئے سنجیدہ بنیادوں پر کوشش کی جا رہی ہے۔ پھر سپریم کورٹ آف انڈیا میں ریفرنس دائر ہوا، وہ لوگ اس نوعیت کی قانون سازی کو ہلکا نہیں لے رہے۔ میرے خیال میں کم از کم بیس وکلاء کی ٹیم عرصہ ایک سال سے کام کر رہے تھے۔

انہوں نے بڑی خوشیاری سے اس کے لئے راہ ہموار کی۔ پاکستان کو برا بھلا کہا، اشتعال دلانے کی کوشش کی، الزامات لگائے لیکن کام سے رکے نہیں۔ مسلسل کام کرتے رہے۔ ہمیں مختلف امور میں مصروف رکھ کر انہوں نے تیاری مکمل کی۔ ۵ اگست سے کچھ دن قبل ۳۰ ہزار بندے کشمیر منتقل کئے۔ ہم سمجھے کہ ہم پر حملہ ہو رہا ہے اور انہوں نے قانونی کاروائی کر کے سب کو حیران کر دیا۔

آپ ذرا غور کریں کہ ہم نے جب کسی کو اپنا مکان کرائے پر دیا ہوتا ہے تو کرائے دار کو نکالنے کے لیے ہم سیدھا وکیل کے پاس جاتے ہیں حالانکہ وکیل سے ہم زیادہ اس کیس کو سمجھتے ہیں، کرایہ دار کو ہم جانتے ہیں۔ ایگریمنٹ ہم نے خود کی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی ہم وکیل کے پاس جاتے ہیں۔

کیوں؟ کیوں کہ وکیل قانون جانتا ہے۔ اس کیس کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔ اسے پتہ ہوتا ہے۔ اس کیس میں قانونی باریکیاں کیا کیا ہے؟ اسے معلوم ہوتے ہیں۔

کشمیر اہم اور حساس ترین معاملہ ہے۔ اس کے لئے ایک بہترین قانونی ورک آوٹ کی ضرورت تھی تاکہ ہم بین الاقوامی دنیا کو بہتر انداز سے قائل کر سکتے۔ مگر بدقسمتی سے ہم سے یہ نہیں ہو پا رہا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کشمیر کے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں سو ہمیں قانونی ٹیم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہماری سب سے بڑی غلطی ہے۔ ہمیں بیس پچیس سال پہلے وکلاء کی ایک ٹیم بنانی چاہیے تھا۔ دس پندرہ ماہرین ہوتے۔ اب تک قانونی قانونی نقطہ نظر سے بہت کچھ حاصل کر چکے ہوتے۔

کیا بین الاقوامی قوانین مسلمانوں کیخلاف ایک سازش ہے؟

س: ہمارے مذہبی طبقہ میں انٹرنیشنل لاء کے حوالے سے ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ سب قوانین مغرب کی ایک سازش ہے جو مسلمانوں کے خلاف اور مسلمانوں کو کنٹرول کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی قوانین کی بنیاد خلاف اسلام ہے لہذا مسلم ممالک اس کے پابند نہیں ہے؟

جواب: آپ نے جو کہا کہ مذہبی طبقہ میں بڑا طبقہ بین الاقوامی قوانین کو سازش کہتا ہے۔ ہاں بالکل یہ بات درست ہے۔ بین الاقوامی قوانین کو آپ سازش کے طور پر پر ٹریٹ کر سکتے ہیں کیونکہ ظاہر ہیں، ممالک کے درمیان رقابت ہوتی ہے، دشمنیاں ہوتی ہے، آگے بڑھنے کی حرص ہوتی ہے جو مختلف سازشی جال بچھانے کا زریعہ بنتے ہیں۔

سازشوں کو قانونی سہارا لیکر پروموٹ کیا جاتا ہے۔اس کا حل یہ ہے کہ قانونی موشگافیوں سے اپنے لئے مختلف قوانین میں مواقع تلاش کئے جائے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہمارے لئے بین الاقوامی قوانین کا سمجھنا نہایت ضروری ہے تا کہ ہم سازش کی زبان جان سکے۔اب ہم نے جن قوانین کا ذکر کیا۔ لاکھوں ہزاروں کنونشنز ہے جس پر دنیا بھر میں عمل درآمد ہو رہا ہے، جو عمل درآمد ہو رہا ہے اس کا ہمیں بھی فائدہ ہے۔مثلا ایک کنونشن ہے کہ فلاں ملک کا جہاز آپ کے حدود اور آپ کے ایئر بیس استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے بدلے آپ بھی وہاں لینڈ کر سکتے ہیں۔

سازشوں کی بات ہو رہی ہے۔ یہ لیکچر ختم ہو جائے تو آپ اقوام متحدہ کے ویب سائٹ پر چلے جائیں Calendar of events دے کے اس کے نیچے ان کانفرنسز کی تفصیل آجائے گی جو اقوام متحدہ کے ماتحت ہو رہی ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جس وقت قانون بن رہی ہوتی ہے ہم وہاں شرکت ہی نہیں کرتے۔شریک ہو تو کوئی تیاری نہیں ہوتی بلکہ اکثر تو بحث میں حصہ ہی نہیں لیتے۔ جب قانون بن جاتا ہے تو پھر ہم رونا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارے خلاف قوانین بن رہے ہیں۔

ایک بین الاقوامی مباحثے کی روداد

میں ایک انٹرنیشنل مباحثے کا حصہ تھا۔ایک بین الاقوامی قانون بن رہا تھا تقریبا ڈھائی سال میں جاتا رہا۔ میں نے جب بھی اپنا نقطہ نظر وہاں پر پیش کیا تو تو بہت سے ممالک کی طرف سے بہتر رسپانس ملا۔ایک دفعہ میں نے تقریر کی تو کئی ممالک کے منسٹر آگئے کہ صوفی صاحب! ہم نے آپ کی تقریر سنیں۔ ہم اس سے مکمل اتفاق کرتے ہیں۔ہمیں تو آج تک اصل حقائق کا ادراک ہی نہیں تھا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر وہاں حقیقی معنوں میں کام کیا جائے تو بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن ہم وہاں کیا کر رہے ہوتے ہیں۔ایک اجلاس میں شریک تھا۔ میں وہاں بیٹا کام کر رہا تھا۔ ہمارے قریب ایک اسلامی ممالک کے نمائندوں بیٹھے ہوئے تھے۔ایک ملک کا نمائندہ مجھے کہتا ہے کہ مجھے کچھ کام ہے۔ میں کہی جا رہا ہوں۔آپ میرے کام کو بھی درہ دیکھئے گا۔وہ قریبا پانچ گھنٹے غائب رہا، میں اکیلے لگا رہا۔وہ شام کو ایسے واپس آیا گویا وہ گھومنے کیلئے ہی یہاں آیا ہو۔آپ محنت کرے تو آپ کی بات کو سنوائی مل سکتی ہے۔

اقوام متحدہ کی چارٹر پر دستخط غلطی تھی؟

سوال: سر جی میرا سوال یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنا کیا ہماری غلطی نہیں تھی۔کیوں کہ اس وجہ سے ہمیں بہت سا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

جواب: نہیں یہ بالکل غلط نہیں ہے بلکہ یہ چارٹر آپ کو ڈیفنڈ بھی کر رہا ہے۔اس چارٹر میں درج ہے کہ آپ سرحدات کو تبدیل نہیں کر سکتے۔آپ صرف اپنے دفاع کیلئے کسی پر حملہ کر سکتے ہے مگر اس پر قبضہ نہیں کر سکتے۔

پاکستان کو اس کا یہ فائدہ ہوا کہ ہماری سرحدیں محفوظ ہوئی۔کوئی ملک آپ پر کوئی آپ پر قبضہ نہیں کر سکتا اور اسی طرح آپ بھی کسی پر قبضہ نہیں کر سکتے۔۱۹۶۵ء میں ہماری فوجیں انڈین زمینوں کو قبضہ کرتے ہوئے بہت آگے تک گئی ہوئی تھی مگر جیسے ہی جنگ بندی ہوئی، آپ کو فوج واپس بلانا پڑی۔۱۹۷۱ء میں ہماری فوج کو شکست

ہوئی۔مگر بنگلہ دیش کو ہندوستان نے اپنا حصہ نہیں بنایا کیوں کہ یو این چارٹر کے رو سے وہ قبضہ نہیں کر سکتے۔ مجبوراانہیں اس علاقے کو آزاد حیثیت سے چھوڑنا پڑا۔

سوال: شق نمبر ۳۷۰ کو تو ہم نے شروع سے ہی قبول نہیں کیا تھا تو پھر اس کو ختم کرنے کا ہمیں نقصان کیا ہے؟

جواب: ۳۷۰ کو تو ہم نے کبھی بھی قبول نہیں کیا،لیکن یہ انڈیا کے آئین میں ان کا اقرار تھا کہ کشمیر انڈیا کا حصہ نہیں ہے اور یہ خصوصی حیثیت کے ساتھ ہمارے ساتھ رہیگا۔اب جب انڈیا نے آئین میں تبدیلی کر کے اس کی مخصوص حیثیت ختم کردی ہے تو یہ قبضہ کے زمرے میں آتا ہے اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی میں آپ کسی زمین پر قبضہ کر کے اپنے ساتھ شامل نہیں کر سکتے۔

ہماری پوزیشن کافی مستحکم ہے پھر بدقسمتی سے ہم نے جذباتی تقریریں تو کئے ہے مگر تحقیقی کام کوئی نہیں کیا ہے۔ اس وجہ سے دنیا بھی خاموش رہی اور ہمارے آواز کے ساتھ اپنی آواز شامل نہ کرسکی۔ کیونکہ کوئی بھی ملک جب کوئی سیاسی قدم اٹھاتا ہے تو پہلے اپنے قانون دانوں سے مشورہ ضرور کرتے ہیں۔اب جب پاکستان کی طرف سے انہیں قانون زبان سے سمجھانے اور قائل کرنے کا کوئی نظم ہی نہیں ہوتو انہوں نے ضرور خاموش رہ جانا ہے۔

وفاقی شرعی عدالت،ایک تعارف

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن
وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد

آج کا جو موضوع ہے وہ جمہوریت، عدلیہ، قانون سازی اوروفاقی شرعی عدالت کے کردار کے حوالے سے ہے۔وقت چوں کہ مختصر ہے،اس لئے سبھی موضوعات کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔میری کوشش ہوگی کہ اپنے گفتگو کو وفاقی شرعی عدالت تک محدود رکھ سکوں اب باقی تمہید جوکہ اسلامائزیشن کے حوالے سے ہے کہ ملک میں اسلامی قانون سازی کس طرح ہوگی؟ وغیرہ۔میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔

اعلی عدالتوں میں شرعی بنچز کا قیام

شریعت کورٹ (وفاقی شرعی عدالت) جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں بنی۔جنرل صاحب نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ملک میں اسلامی قوانین کا خدوخال کریں گے۔اس سے متصل یہ اعلان بھی کیا گیا کہ جنوری ۱۹۸۷ ء سے ملک کی اعلی عدالتیں ہراس قانون کوکالعدم کرنے کا مجاز ہوں گے جوکہ قرآن وسنت کے منافی ہو۔

انہوں نے سب سے پہلے حدودقوانین نافذ کئے،اس کے ساتھ ہی انہوں نے تمام ہائی کورٹس میں شریعت بنچز قائم کئے،ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ ملک کے جوقوانین ہیں ،اس کو اسلامی سانچے میں ڈالا جائے اوراس کے لئے وہ شہریوں کے آرا بھی سننے کی کوئی ترتیب بنائے۔ پورے ملک کے تمام ہائی کورٹس میں یہ کام شروع ہوا،شریعت بنچز فعال ہوئے۔شریعت بنچز کی طرح سپریم کورٹ میں بھی ایک بنچ قائم کی گئی جسے شریعت اپیلٹ کا نام دیا گیا کہ اگرکوئی ہائی کورٹ میں بنے شریعت بنچز سے صادر شدہ فیصلوں کے خلاف اپیل کرنا چاہےتو وہ سپریم کورٹ میں اپیلٹ شریعت بنچ میں کرسکے۔

وفاقی شرعی عدالت

ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کی شریعت بنچز تین تین ارکان پر مشتمل ہوتی تھیں۔کچھ وقت بعدان بنچز پر رش بہت زیادہ ہوگیا۔یہ محسوس کیا گیا کہ شریعت بنچز کوایک مکمل جداگانہ ادارے کی حیثیت دی جائے اور یوں وفاقی شرعی عدالت کا قیام عمل میں لایا گیا۔

وفاقی شرعی عدالت کے خدوخال

وفاقی شرعی عدالت آٹھ ارکان پر مشتمل عدالت ہے۔اس عدالت کے ارکان صدرمملکت کے منظوری سے تعینات ہوتے ہیں جوکہ پاکستان کے عدالت عظمی یا پھرکسی بھی صوبائی عدالت عالیہ کے ریٹائر یا حاضر سروس ججز میں سے ہوتے ہیں۔ان آٹھ ججز میں تین ججز کا ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ علوم اسلامیہ پرمکمل عبور رکھتے ہو اور انہیں اسلامی قوانی کا وسیع تجربہ ہو۔

وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار

☆ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے ہائی کورٹس اور تمام ماتحت عدالتوں پر لاگو ہونگے۔

☆ وفاقی شرعی عدالت کے کسی بھی فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کے شرعی اپیلٹ بنچ میں اپیل کی جاسکتی ہے۔

☆ وفاقی شرعی عدالت وقتا فوقتا رائج الوقت تمام قوانین کا جائزہ لے گی جوقوانین اسلام کے منافی ہوں گے،ان کے حد جو اسلام کے موافق ہوگی،ان کی فہرست گزٹ نوٹیفیکیشن میں شائع ہوگی۔

☆ ہرفقہ کے پیروکاروں کے لئے فیصلہ ان کے فقہ کے موافق ہوگی۔

وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ سود

وفاقی شرعی عدالت کے اختیار سماعت سے چار قسم کے قوانین باہر کر دیئے گئے ہے۔

(۱) دستور (۲) عدالتی طریقہ کار سے متعلق قوانین

(۳) مسلم شخصی قانون اور (۴) مالیاتی قوانین

ان میں مالیاتی قوانین کا دورانیہ پہلے پہل دو سال تھا جو کہ بعد میں پانچ سال اور پھر دس سال کر دیا گیا۔ یہ مدت سن ۹۰ء میں ختم ہوئی مگر دو تہائی اکثریت اور دباو کی وجہ سے حکومت اس شق میں ابھی تک ترمیم نہ کرسکا اور مدت میں اضافہ نہیں کیا جاسکا۔ بہت سی درخواستوں کے ذریعے سودی قوانین کو شریعت سے تصادم کے بنیاد پر چیلنج کیا گیا۔ ۱۹۹۱ء میں عدالت نے اپنا فیصلہ سنادیا جس کے تحت ان قوانین کو کالعدم قرار دے کر ان میں ترمیم کے لئے حکومت کو کہا گیا کہ اگر چھ مہینے میں ان قوانین کو شریعت کے موافق نہیں کیا گیا تو یہ از خود ختم ہو جائیں گے۔ حکومت نے اس حکم کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی اور اس کے بعد تقریبا آٹھ سال تک اس کیس کی سماعت نہیں ہوسکی۔ ۱۹۹۹ء میں جب بالاخر اس کی سماعت شروع ہوئی۔ سپریم کورٹ میں ایک پنچ رکنی شریعت اپیلٹ بنچ تشکیل دیا گیا جس نے کئی ماہ تک مسلسل ان اپیلوں کی سماعت کی۔ پانچ رکنی اس بنچ میں جناب جسٹس خلیل الرحمٰن خان بطور چیئرمین شریک تھے، جناب جسٹس وجیہ الدین، جناب جسٹس منیر اے شیخ، جناب جسٹس مفتی تقی عثمانی اور جناب جسٹس محمود احمد غازی بطور ممبر شریک تھے۔ معزز عدالت نے سماعت کے دوران مقدمہ میں زیر بحث آنے والے اہم فقہی، معاشی، معاشرتی، قانونی اور آئینی ایشوز پر رہنمائی حاصل کرنے کیلئے فریقین کے وکلاء حضرات کے علاوہ ماہرین علم وفن سے بھی اپیل کی کہ وہ زیر بحث مسئلہ کے حوالے سے عدالت کی معاونت کریں۔ چناں چہ پاکستان سمیت اسلامی دنیا کے متعدد نامور محققین اور قانون دان حضرات نے فاضل عدالت کو اپنی آراء اور تجاویز سے مستفید

کیا اور جدید وقدیم معاشی کتب و جرائد کے بے بہا ذخیرے میں سے اہم اقتباسات کے نقول ودالت کے ریکارڈ پر لائی گئی۔

اس سارے مواد کی چھان پھٹک اور علماء اور وکلاء کی بحثوں کی سماعت کرنے کے بعد سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو عمومی طور پر درست قرار دیتے ہوئے جدید بینکاری سمیت تمام دیگر سودی قوانین کو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ممنوع اور حرام قرار دے دیا اور حکومت وقت کو ہدایت جاری کی کہ وہ جون ۲۰۰۱ء تک تمام غیر اسلامی قوانین کو نئے قوانین سے بدل کر بینکنگ سمیت دیگر معاشی معاملات کو سود سے پاک کردے۔

حکومت نے کئی تاخیری حربے استعمال کئے مثلا بنچ کے ایک رکن جسٹس خلیل الرحمٰن خان کو وفاقی محتسب بنا کر بنچ کچھ مدت کے لئے توڑ دیا۔ حکومت نے عدالت میں درخواست بھی دائر کردی کہ وہ اپیل واپس لے کر وفاقی شرعی عدالت میں نظر ثانی کی درخواست دائر کرنا چاہتی ہے لیکن عدالت نے یہ درخواست مسترد کردی۔ دسمبر ۱۹۹۹ء میں سپریم کورٹ میں درخواست دی کہ مدت میں مزید اضافہ کیا جائے، چناں چہ عدالت نے مدت ۳۰ جون ۲۰۰۲ء تک بڑھادی۔

جب یہ مدت پوری ہونے کو آئی تو یونائیٹڈ بینک نے سپریم کورٹ میں نظر ثانی کی درخواست دائر کردی۔ اس دفعہ عدالت نے نہ صرف اپنے پچھلے فیصلے کو ختم کر دیا بلکہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو بھی ختم کر دیا اور کیس واپس وفاقی شرعی عدالت میں بھیج دیا جہ وہ از سر نو اس کا جائزہ لے اور بعض نئے اٹھائے گئے سوالات پر بھی فیصلہ سنادے۔

اس دوران ایک بڑا واقعہ یہ رونما ہوا کہ PCO پر حلف نہ اٹھانے کی بنا پر جسٹس خلیل الرحمٰن اور جسٹس وجیہ الدین ریٹائر کردیئے گئے۔ جسٹس محمود احمد غازی بھی ایک اور حکومتی عہدے پر فائز ہونے کی بنا پر شریعت اپیلٹ بینچ کا حصہ نہ رہے۔ صرف جسٹس منیر اے شیخ اور مولانا مفتی تقی عثمانی بینچ کا حصہ رہ گئے لیکن سماعت سے قبل تقی عثمانی صاحب کو بنا کچھ کہے شریعت اپیلٹ بینچ سے فارغ کر دیا گیا اور علماء نشستوں پر علامہ خالد

محمود اور رشید احمد جالندھری کو شامل کرلیا گیا۔اس نئے بینچ میں جسٹس شیخ ریاض احمد بطور چیرمین منتخب ہوئے

اس نئے بنچ کی کاروائی کا خلاصہ یہ ہے کہ UBL کے وکیل نے ۱۲ جون ۲۰۰۲ کو بحث کا آغاز کیا،قرآن مجید کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی کہ جدید بینکنگ کا نظام ''بیع'' کے وسیع تر مفہوم پر پورا اترتا ہے۔اس لئے بینکنگ انٹرسٹ کو ربا قرار دے کر حرام کہنا ٹھیک نہیں ہے۔انہوں نے یہ موقف بھی اختیار کیا کہ اسلام کے نزدیک سود کا صرف ظالمانہ شرح ہی ناجائز ہے اور سمپل انٹرسٹ ظالمانہ نہیں ہے۔انہوں نے یہ دعوی بھی کیا کہ سود کی تعلیمات قانونی درجے کی نہیں ہے بلکہ اخلاقی درجے کی ہے۔اس لئے سود کی ممانعت بزریعہ قانون نافذ کرنا انصاف کے مطابق نہیں۔

حکومت پاکستان کے وکیل نے دلائل کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ حکومت UBL کی درخواست سے مکمل اتفاق کرتی ہے۔شریعت اپیلٹ بینچ اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں پر عمل درآمد ناممکن ہے۔انہوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ربا اور سود کے امتناع سے معاشی انارکی پھیلے گی اور تمام کاروبار معیشت درہم برہم ہوجائے گا۔اس لئے انہوں نے سابقہ فیصلے کی تنسیخ کا مطالبہ کیا اور یہ دعوی بھی کیا کہ ہم نے تمام ۵۳ اسلامی ممالک سے اس حوالے سے رابطہ کیا لیکن تمام ممالک نے مشورہ دیا ہے کہ اس طرح کا نظام جس میں سود نہ ہو ناقابل عمل ہے بلکہ یہ بھی کہ معیشت کے لئے تباہ کن ہوگا اور اس طرح ہم بین الاقوامی برادری سے کٹ جائیں گے۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل آف پاکستان مخدوم علی خان نے بھی عدالت کے سامنے سابقہ فیصلوں پر تنقید کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ وفاقی شرعی عدالت اور شریعت اپیلٹ بینچ نے سماعت کرتے ہوئے آئین پاکستان میں بیان کئے گئے ضوابط کے مطابق نہ تو اپنے اختیارات سماعت کا خیال رکھا ہے۔یہ مقدمہ سرے سے ان کے دائرہ اختیار میں ہی نہیں ہے۔

چند دن کی مختصر سماعت کے بعد نظر ثانی کے لئے تشکیل کردہ بینچ نے انتہائی عجلت

میں فیصلہ سناتے ہوئے وفاقی شرعی عدالت اور شریعت اپیلٹ بنچ کا فیصلہ منسوخ کردیا اور مقدمہ کو ازسرنو سماعت کے لئے وفاقی شرعی عدالت میں بھیجنے کے احکامات صادر کردیئے۔

انسداد سود کی کاوشوں کا دور ثانی ۲۰۱۲ء سے شروع ہوتا ہے۔تنظیم اسلامی کی مرکزی سطح پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ فیڈرل شریعت کورٹ میں انسداد سود کا معاملہ سپریم کورٹ آف پاکستان سے ریمانڈ شدہ ۲۰۰۲ء سے مرض التواء میں پڑا ہے لہذا کوشش کی جائے کہ اسے سماعت کے لئے Fix کروایا جائے۔چناں چہ ۱۴ اگست ۲۰۱۲ء کو ایک درخواست بعنوان Application To Fix For Hearing خالد محمود عباسی بمقابلہ فیڈریشن آف پاکستان بذریعہ سپریم کورٹ کے وکیل کوکب اقبال صاحب فیڈرل شریعت کورٹ میں داخل کی گئی،جس میں انسداد سود کی سابقہ کوششوں اور سپریم کورٹ کے فیصلے ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۲ء کو بنیاد بناتے ہوئے کیس ری اوفن کرنے کی استدعا کی گئی۔

اس کے جواب میں ۱۷ اگست کو فیڈرل شریعت کورٹ کی جانب سے یہ جواب دیا گیا کہ درخواست گزار چوں کہ مذکورہ کیس میں فریق نہیں ہے اور چوں کہ یہ درخواست فیڈرل شریعت کورٹ کے پروسیجر کے مطابق نہیں ہے اس لئے یہ درخواست رد کی جاتی ہے۔

اس جواب کے موصول ہونے پر خالد محمود عباسی کے جانب سے ایک دوسری درخواست بعنوان Petition under article 203.d of the constitution of pakistan دائر کی گئی جو کہ ایک آئینی درخواست تھی۔اس درخواست میں پاکستان کے آئینی تشخص اور ریاست پاکستان کے آئینی زمہ داریوں کو سامنے رکھتے ہوئے کیس پر نظر ثانی کی استدعا کی گئی تھی۔اس پٹیشن کے دائر کئے جانے کے نتیجے میں فیڈرل شریعت کورٹ نے ۲۶ ستمبر ۲۰۱۳ء کی تاریخ برائے ابتدائی سماعت دے دی اور اس جیسی دوسری متعدد درخواستوں کو یکجا کرتے ہوئے تمام کیسز سننے کا عندیہ ظاہر کیا۔

اب تک اس میں کئی پیشیاں ہوچکی ہے۔ہم دعا گو ہے کہ اس کیس کا جلد از جلد کوئی ختمی نتیجہ برآمد ہو۔

جمہوریت مخالف مذہبی بیانیہ

مولانا ڈاکٹر عمار خان ناصر

مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ

جمہوریت مخالف بیانیہ

جمہوریت مخالف یا جمہوریت پر تنقید کرنے کے حوالے سے ہمارے ہاں دو موقف سامنے آئے ہیں۔ دونوں موقف کی ابتداء ایک ساتھ ہوا۔ مگر آگے جا کر یہ ایک موقف دوسرے میں تبدیل ہوگیا۔ جمہوریت مخالف بیانیہ اس قدر شدت کے ساتھ پہلی دفعہ سننے میں جب آیا، وہ ہمارے طالب علمی کا زمانہ تھا۔

پہلا موقف مولانا صوفی محمد مرحوم کا ہے۔ ان کا بیانیہ یہ تھا کہ جمہوریت اسلام مخالف اور غیر شرعی نظام ہے۔ جمہوریت کو اسلامی نام دینے سے یہ اسلامی نہیں بن جاتی۔ بلکہ کفر کفر ہی رہتا ہے چاہے خانہ کعبہ میں اس کی پرستش کیوں نہ کی جا رہی ہو۔

دوسرا موقف ملا فضل اللہ کا ہے، جنہوں نے وہی پرانا مقدمہ، انہیں اصطلاحات کے ساتھ پیش کیا۔ البتہ محرکات دونوں حضرات کے الگ الگ تھے۔ صوفی محمد صاحب کا جو موقف ہے جہاں تک مجھے سمجھ آتی ہے وہ ملک کی اندر جو داخلی معاملات ہیں، جیسے ملک میں رائج میکنزم ہوا یا سوشلزم۔ ان کو اس پر اعتراض تھا کہ شریعت کا حکم سب سے بالاتر ہوتا ہے۔ انسان شریعت کے تابع ہوتے ہیں، شریعت کسی کی اطاعت قبول نہیں کرتی۔ شرعی احکام کے نافذ العمل ہونے کو عوامی نمائندوں کی منظوری سے مشروط کرنا یا لوگوں کی منظوری یا نامنظوری پر اس بات کو ڈیفنڈ کرنا کہ یہ قانون منظور ہوگا یا نہیں؟ یہ خلاف شرع ہے۔ اس میں تبدیلی آنی چاہئے تاکہ یہ ملک حقیقی فلاحی اسلامی ریاست بن سکے۔

اس کے قریبا ایک دہائی بعد یہی موقف تحریک طالبان پاکستان (TTP) مزید شدت کے ساتھ پیش کی۔ استدلالات یہی تھے مگر بیک گراونڈ چینج ہوگیا تھا۔ صوفی محمد صاحب اس نظام میں کچھ بنیادی اصلاحات کرنے شرعی کی بالادستی چاہتے ہیں۔ جبکہ ٹی ٹی

پی یہ استدلال ایک بڑے موقف کی تائید کے طور پیش کر رہی تھی۔ گویا ان کے سامنے ایک بڑا ہدف ہے اور جمہوریت اس ہدف کے حصول کی طرف پہلا قدم تھا۔

اصل مسئلہ جمہوریت نہیں قومی ریاست ہے

تحریک طالبان پاکستان اور اس قسم بیانیہ رکھنے والوں کا اصل مسئلہ جو ہے جس پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ جمہوریت نہیں ہے، خاص طور پر ٹی ٹی پی کے ساتھ جمہوریت پر بات کرنا اور انہیں جمہوری فکر اپنا کر مین سٹریم میں آنے کا قائل کرنا اصل نکتے پر بحث نہیں ہے کیونکہ ان کا اصل مسئلہ جمہوریت نہیں قومی ریاست ہے۔

قومی ریاست قابل قبول ہے کہ نہیں؟

ہمیں جمہوریت پر بحث کرنے کے بجائے قومی ریاست اور اس سے جو مسائل وابستہ ہے پر بات کر لینی چاہئے۔ شریعت کے رو سے کیا قومی ریاستوں کا تصور قابل قبول ہے؟ قومی ریاست میں قومیت کے مفاد پر فیصلے کئے جاتے ہیں کیا شریعت میں اس کا جواز موجود ہے کہ نہیں؟ یہ وہ امور ہے جو ڈسکس کرنے کے قابل ہے۔

قومی ریاستوں کے وجود کو اگر درست مان لیا جائے تو جمہوریت ماننا مشکل نہیں رہتا لیکن جو فرد یا گروہ قومی ریاست کا ہی منکر ہو اسے جمہوریت کے قائل کرنا کارے دارد۔ ہمارے مین سٹریم مذہبی حلقہ عجیب کشمکش اور تذبذب کا شکار ہے۔ جمہوریت کے موضوع پر یہ طبقہ طالبان اور اینٹی ڈیموکریسی طبقہ کے خلاف کھڑے ہیں۔ یہی طبقہ ہوتا ہے، بات جب قومی ریاستوں کے جواز کی آتی ہے تو یہ طبقہ اب ریاستی بیانیہ کے خلاف دکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔ ابتداء میں یہ مجھے پریشان کرتے تھے لیکن اب عادت ہو رہی ہے۔ یہ طبقہ ہر جگہ موجود ہے۔ ہم نے شدت پسندوں کے خلاف آپریشنز کئے۔ دہشتگردوں کو مارا۔ مگر ہم نے شدت پسندانہ سوچ کو ختم کیا کہ نہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ س کا حل یہ ہے کہ ہم دونوں نظریات کے حامل افراد کو ایک ساتھ بٹھائیں، دونوں کے درمیان مکالمہ ہو، ایک فکر کی بات مضبوط ہو تو دوسرا فکر اس کو مان لے، لیکن ہوا

یہ کہ ہم نے ایکشن لے کر طاقت کے ساتھ حکمت عملی اپنائی اور طاقت ک کے بل بوتے ان کو ختم کر دیا۔ اس قسم سوچ رکھنے والوں کے ذہنوں میں جو سوالات تھے وہ ہم نے حل نہیں کئے۔

خلافت عثمانیہ کے سقوط تک مسلمانوں کو ایک بڑی سیاسی طاقت کی حیثیت حاصل تھی۔ سب ایک مرکز سے جڑے ہوئے تھے۔ مرکز کے ہوتے ہوئے سیاسی وحدت اور مرکز سے جڑے ہوئے مسلمان اور اس کے علاوہ غیر مسلم کہلاتے تھے۔ دنیا بھر میں جو مسلمان ہوتا اس کا تعلق سیاسی وحدت کے ساتھ ضرور ہوتا۔ دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور بھی اسی بنیاد پر ہے۔

قومی ریاستوں کے تصور نے سب کچھ بدل ڈالا ہے۔ اب جو بھی فیصلے کئے جاتے ہیں وہ ملکوں کے مفاد کے پیش نظر کئے جاتے ہیں۔ ممالک مسلم ہے یا غیر مسلم، اس کو نہیں دیکھا جاتا۔ میرے کتنے مفاد وابستہ ہے اس کو دیکھا جاتا ہے۔ آپ کے جغرافیائی لحاظ سے یا سیاسی لحاظ سے کس ملک کے ساتھ آپ کے مفاد وابستہ ہیں اگر آپ کے جغرافیائی سرحدات کس کے ساتھ ملتے ہیں، چاہے وہ غیر مسلم ریاست ہو یا مسلمان ریاست، ان کے ساتھ ساتھ آپ کے تعلقات الگ ہوں گے۔ حال ہی میں کشمیر تنازع رونما ہوا۔ ہم نے عرب ممالک سے بہت شکوہ شکایتیں کئے مگر اصل حقیقت پر کسی نے بھی غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اقوام اپنے مفاد کو دیکھتے ہیں اور اس وقت عرب ممالک کے مفاد انڈیا کے ساتھ وابستہ ہے۔

مذہبی فکر کی دوعملی

مین سٹریم مذہبی فکر کی بات ہو رہی تھی جو کہ جمہوریت پر یقین تو رکھتی ہے لیکن ساتھ قومی ریاست کے وجود کے مخالف بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طبقہ کے ساتھ بات کرنے کا اصل میدان تاریخ ہے۔ تاریخ میں کیا ہے؟ تاریخ کیسے آگے بڑھتی ہے؟ اور تاریخ میں کیسے تبدیلی آتی ہے؟ اس کی تفہیم بہت ضروری ہے۔

تاریخ میں جب ہم جائیں گے تو وہاں شرعی مسائل سے پہلے ہمیں کچھ اور چیزیں بھی سامنے آتی ہے۔جس طرح فقہیات میں اللہ تعالی کے کچھ قوانین اور احکام ہے۔اسی طرح تاریخ میں بھی کچھ قوانین اور احکام جاری ہوتے ہیں جس کے روشنی میں تاریخ کا عمل آگے بڑھتا ہے۔فقہ اور دوسرے چیزیں تاریخ کے تابع ہوتے ہیں۔خاص طور پر سیاست ،قانون اور تعلقات کا جو نظم ہے اس کا تاریخ سے خاص تعلق ہے۔تاریخ میں جب تبدیلی آتی ہے تو ان احکام میں بھی تبدیلی ناگزیر ہوجاتی ہے۔

دنیا میں عروج وزوال کا قانون

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے لئے اللہ تعالی نے ایک قانون وضع کیا ہے وَ تِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا قوموں پر حالات بدلتے رہتے ہیں۔کوئی غالب آتا ہے تو کوئی پستی میں چلا جاتا ہے۔غلبہ اور کامیابی کا فیصلہ اللہ تعالی حق اور باطل کے بنیاد پر نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے کچھ اور معیارات ہیں جو انہوں نے ہمیں بیان کردیئے ہیں۔یہ لازم نہیں ہے کہ جو حق پر ہو وہی سپر پاور بھی ہوگا۔اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر آپ دنیا میں طاقت ور تہذیبوں کو دیکھئے تو اس میں مسیحی تہذیب کے ساتھ ساتھ شرک پر بنی تہذیبیں بھی شامل ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالی نے ایک زمانے میں ایک گروہ کو وہی خصوصیتیں دی جو کسی سپر پاور کے لئے ضروری تھی۔یہ دور سلطنتوں کا دور تھا۔اس میں دو سلطنتوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔وہ ہمیشہ جھگڑتے رہتے تھے۔شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس کی یوں توضیح کی ہے کہ یہ وہ وقت تھا جس میں اللہ تعالی کے تکوین کا تقاضہ یہ تھا کہ جتنا لوگوں کے اخلاقی معاملات میں بگھاڑ پیدا ہو چکا ہے اور اس نے جبر اور استحصال کی جو شکل اختیار کر لی ہے،معیشت میں کچھ لوگ ایسے بن گئے ہیں جو دوسرے لوگوں کی کمائی بھی کھا جاتے ہیں یعنی تمدن معیشت اور یہ ساری چیزیں فساد کا شکار ہوچکی تھی۔اللہ تعالی چاہتا تھا کہ اس کی اصلاح ہو۔تمدن از سر نو منظّم ہو۔اللہ تعالی کے مبعوث انبیاء کرام نے اپنے اپنے بساط

کے مطابق تمدن میں بگھاڑ ختم کرن کی بھی کوشش کی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تو تکوین کا تقاضہ یہ تھا کہ اس بگڑے ہوئے تمدن کی جگہ ایک صالح تمدن وجود میں آئے۔اس کے لئے ناگزیر تھا کہ جزیرہ عرب کے اردگرد جو دو ریاستیں قائم ہے اس کو ختم کیا جائے اور اس کی بجائے ایک نیا ریاست وجود میں آئے۔جو اس صالح تمدن کا علم بردار ہو۔

اس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا تھا کہ یہ طاقت اور یہ سربلندی ہمیشہ سے ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو بار بار تنبیہ فرمائی تھی کہ اس کی ایک انتہا ہے۔جہاں پہنچ کر یہ ختم ہوجائے گا۔عرب جب اس انتہا پر پہنچے اور ان میں وہ چیز نہ رہی تو پھر اللہ تعالی نے ترکوں کو غالب کیا۔ترک زوال پذیر ہوئے تو وحدت ختم ہوگئی اور عثمانیہ سلطنت تقسیم ہوکر کئی خودمختار ریاستیں بن گئی۔

مذہبی طبقہ اور بین الاقوامی قانون

جس طرح مذہبی میں سٹریم حلقہ قومی ریاستوں کے حوالے دوراہے پر کھڑا ہے اسی طرح بین الاقوامی قوانین پر بھی وہ تذبذب کا شکار ہے۔پورے عالم اسلام میں جو سرکردہ علماء ہے وہ قومی ریاستوں اور اس کے لئے تشکیل شدہ بین الاقوامی قوانین کے حق میں ہے اور اس کو جائز کہتا ہے اور اسے چند تحفظات کے ساتھ اسلام سے ہم آہنگ مانتے ہیں، ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرنا،ایک دوسرے کے حدود کا خیال رکھنا،آپس میں جنگ نہ کرنا اور جنگ کے بجائے تنازعات کو گفت وشنید سے حل کرنا سب عین اسلام ہے۔بین الاقوامی سطح پر مذہبی طبقہ بنیادی طور پر اس نظام کی حمایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام جنگ نہیں چاہتا وہ امن کا دین ہے اور امن سے رہنے کی ترغیب دیتا ہے،اگر پرامن تعلقات ہو،کوئی ریاست تم پر جبر نہ کریں اور اپنے ملک میں وہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی دیں تو اس صورت میں جنگ کرنے کی اور خوامخواہ لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔اگر بین الاقوامی قوانین سے جنگیں رکھی ہوئی ہے اور خون خرابہ نہیں ہورہا۔اس کے

علاوہ مسلمانوں کو بھی مذہبی آزادی ملی ہوئی ہے تو یہ نظام اسلام میں قبول ہے۔اس کے علاوہ جو دوسرا طبقہ ہے جو خلافت، مرکزیت اور وحدت کو صد سال کے نظام میں دیکھنا چاہتا ہے جس میں بین الاقوامی سطح پر سیاسی تقسیم دارالحرب اور دارالکفر کے حوالے سے ہوئی تھی۔اس فکر کا بڑا عقلی سوال ہے وہ یہ ہے کہ جن اصولوں پر اور جس تعبیر پر آپ موجودہ بین الاقوامی قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کہہ رہے ہو تو ہمارے ہاں جو مستند روایت فقہی اور تاریخی روایت میں تو یہ تعبیر نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا کلاسیکی تعبیر میں سیاسی تقسیم کفر اور اسلام کے بنیاد پر ہی ہے، اس میں پر امن تعلقات یا مذہبی آزادی کی بات نہیں ہے بلکہ غلبہ اسلام کا کہا گیا ہے۔اس کا لب لباب تو یہ نکل رہا ہے کفار کے غلبہ اور مسلمانوں کی مغلوبیت کو جائز باور کرنے کے لئے آپ لوگ استدلال گھڑ رہے ہیں۔

مذہبی میں سٹریم بین الاقوامی طبقہ تعبیر اس طور پر کر رہی ہے کہ ہمارا استدلال ہی ہمارے روایت کی اصل تعبیر ہے۔یہ طبقہ سیرت، قرآنی جزیات اور مختلف احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں بھی ایک جیسے حالات نہیں رہے ان میں مختلف حکمت عملیاں رہی ہے۔اس وجہ سے سیرت، قرآن اور سنت میں دونوں طرح کی روایتیں مل جاتی ہے۔اس کے باوجود یہ طبقہ اس کی طاقت نہیں رکھتے جو یہ کہے کہ ہم روایت سے الگ تعبیر کرتے ہیں مگر ہمارے ساتھ بھی دلیل موجود ہے۔اس کے بجائے وہ کہتے ہیں کہ ہم جو تعبیر کر رہے ہیں یہی اصل مستند روایت ہے۔اس طبقہ دو تعبیروں کے سرے سے اقرار نہیں کرتے۔ان آپ جہاد کی تعبیر کو ہی دیکھئے، اس طبقہ نے جو تعبیر اپنائی ہمارے غیر مسلم سکالرز بھی اس کو درست نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں: آپ کی روایت میں یہ تعبیر نہیں ہے۔

اس کا بنیادی طور پر حل یہ ہے کہ ہم دونوں نوع کی تعبیروں کا اقرار کریں، دونوں کا جائزہ لے اور پھر اپنا مدعا پیش کریں کہ اس دور کے یہ تقاضے ہیں جس کے ہمارے پاس یہ یہ دلائل ہیں۔

جمہوریت اور ولایت فقیہ

جناب علامہ ثاقب اکبر

سربراہ البصیرہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد

و مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''پیام''

ولایت فقیہ کیا ہے؟

ولایت بمعنی حکومت ،یعنی فقیہ کی حکومت۔ آپ اپنے لفظوں میں علما کی حکومت بھی کہہ سکتے ہیں۔حکومت کا مقصد چوں کہ قرآن وسنت کا نفاذ ہوتا ہے اور قرآن وسنت کی درست تعبیر ہی کو نافذ کرنے کے لئے قرآن وسنت کے ماہرین کو اہمیت دینا ضروری ہے۔ ولایت فقیہ کی جگہ آپ اس کو اسلامی حکومت بھی کہہ سکتے ہیں۔امام خمینی نے خود بھی اپنے خطاب میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔انہوں نے اپنی کتاب کو'' ولایت فقیہ یا اسلامی حکومت'' سے موسوم کر رکھا ہے۔

امام خمینی نے حکومت کے لئے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ حکومت کے اوپر ایک کمیٹی موجو ہو جو اس پر نظر رکھے ہوئے ہو کہ مسلمان پر لاگو قوانین اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟ امام خمینی جب واپس ایران آئے تو انہوں نے انتظامیہ قائم کی۔اس انتظامیہ کی سرپرستی میں ریفرنڈم کیا،عوام سے ان کی مرضی پوچھی گئی کہ آیا وہ اسلامی حکومت چاہتے ہیں یا کوئی دوسرا نظام۔ریفرینڈم میں پچانوے فیصد لوگوں نے اسلامی حکومت کے حق میں ووٹ دیا۔اسلامی حکومت بنانے کے لئے عوامی اکثریت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے پھر ایک آئین بنایا اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس آئین کو بھی ریفرینڈم کے لئے پیش کیا گیا۔

مجلس خوبرگان

اس وقت جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ایران کے نظام میں ایک ولی فقیہ ہوتا ہے۔ ولی فقیہ کے انتخاب کے لئے ایک مجلس خوبرگان ہوتی ہے۔مجلس خوبرگان یعنی ایک قسم کا بااختیار پارلیمان جس کے نمائیندے فقہا ہوتے ہیں۔

مجلس خوبرگان کے لئے طریقہ انتخاب

مجلس خوبرگان کے لئے نمائندے ملک بھر سے منتخب ہوتے ہیں۔جس طرح یہاں پر پارلیمنٹ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پہلے ان کا انتخاب ہوتا ہے پھر یہ مجلس خوبرگان ولی فقیہ منتخب کرتے ہیں۔ گویا ولی فقیہ ان ڈاریکٹ ووٹ سے عوام کا منتخب کردہ ہوتا ہے جیسے ہمارے ہاں وزیراعظم ان ڈاریکٹ ووٹ سے عوام کا منتخب کردہ ہوتا ہے۔

مجلس خوبرگان کا دورانیہ

مجلس خوبرگان کے نمائندے چار سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔چار سال مکمل ہونے کے بعد ان کی میعاد ختم ہوجاتی ہے پھر ایک نئی خوبرگان بنتی ہے۔وہ از سرنو ولی فقیہ کو منتخب کرتی ہے۔مجلس خوبرگان جب ولی فقیہ کو منتخب کرتی ہے تو پھر وہ تب تک رہتا ہے جب تک اس کے خلاف مجلس خوبرگان عدم اعتماد کی تحریک نہیں لاتے۔

وہاں ہمارے ہاں کی طرح دو ایوانیں نہیں ہے بلکہ ایک ایوان ہوتا ہے۔ان کے ایوان کو'' شوری اسلامی'' کہتے ہے۔پارلیمنٹ کے نمائندے ہمارے ہاں کی طرح منتخب ہوتے ہیں۔مختلف حلقوں میں لوگ ووٹ دیتے ہیں اور شوری اسلامی منتخب ہو جاتی ہے۔ان کا صدر ڈاریکٹ ووٹ سے منتخب ہوتا ہے۔ملک بھر کے عوام اسے ووٹ دیتے ہیں۔اس کے بعد صدر اپنے کابینہ کا اعلان کرتا ہے۔ارکان پارلینمٹ پورے کابینہ کو ووٹ دیتی ہے۔ایک ایک بندہ آتا ہے صدر سے پوچھا جاتا ہے کہ اس کی کوالیفیکشن کیا ہے؟ پارلیمنٹ یا تو اس بندے کی منظوری دیتی ہے یا پھر اس کو رد کر دیا جاتا ہے۔رد کرنے کی صورت میں صدر نئے شخص آگے لاتا ہے۔اس طرح سے کابینہ بن جاتی ہے۔

شوریٰ نگہبان

وہاں ایک اور شوری بھی موجود ہے۔اس کو''شوری نگہبان'' کہتے ہیں۔ اس میں چھ فقیہ ہوتے ہیں جن کو ولایت فقیہ اپنے صوابدید پر منتخب کرتے ہیں۔ یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ جو قانون پارلیمنٹ نے پاس کیا ہے وہ آئین اور شریعت کے مخالف تو نہیں ہے؟

اگر مخالف ہو تو یہ لوگ اس کو رد کر دیتے ہیں وہ واپس پارلیمنٹ میں چلا جاتا ہے۔ جہاں مجلس خوبرگان اس میں ضروری ترمیم کر کے دوبارہ پاس کرا دیتے ہیں۔

شوریٰ نگہبان کے ذمہ ایک اور اہم کام بھی ہوتا ہے۔ الیکشن لڑنے والے ارکان کی کوالیفیکیشن بھی یہ شوری کرتی ہے۔ اس معاملے میں شوری نگہبان بہت سخت رویہ اختیار کرتا ہے صدر اور ولایت فقیہ کے مابین اختیارات کی بات ہوتی رہتی ہے مگر صدر کے مقابلے میں ولی فقیہ اختیارات زیادہ ہیں کیونکہ وہ خود کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت ہے ایران کے آئین میں یہ بات لکھی ہے کہ حکومت ایران کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کی مظلوموں کی حمایت کرے، حق کی حمایت کرے، مستضعفین اور محرومین کی حمایت کرے۔ اسی طرح کی چیزیں اس میں لکھی گئی ہیں۔ وہ فلسطین کی جو حمایت کرتے ہیں یا پھر ابھی جو انہوں نے کشمیر کی حمایت کی ہے وہ انہوں نے اسی تناظر میں کی ہے۔

علامہ اقبال کا جو نظریہ تھا کہ پارلیمنٹ اجتہاد کریں وہ اسی سوچ کے تحت تھیں۔ ظاہری بات ہے کہ منصوص اور موجود مسائل میں تو وہ تبدیلی نہیں لا سکتے، مگر نئے قوانین کو وہ اسلام کے موافق بنا سکتے ہیں۔ یہ اختیار علامہ اقبال پارلیمنٹ کو دینا چاہتے ہیں مگر یہ سوال ہوا کہ اگر پارلیمنٹ قرآن وسنت کے عالم نہ ہو تو پھر کیا ہوگا۔ انہوں نے اس کا حل یہ پیش کیا تھا کہ علما کی ایک کونسل بنائی جائے ان سے مشاورت طلب کی جائے۔ اس کے روشنی میں پھر کوئی قدم اٹھالی جائے۔

ایران کا آئین کہتا ہے کہ شیعوں کے لئے فقہ جعفریہ واجب العمل ہوگا جبکہ غیر شیعہ کے لیے ان کے فقہ کے قوانین موافق قانون بنے گا آپ اپنی اصلاح اس میں لگا سکتے ہیں ایک جنرل لا ہے اور ایک اسپیشل لا۔

اور ایک بات میں کلیئر کر دوں وہاں ایک مرکزی حکومت ہوتی ہے وہاں سے صوبوں کے لیے گورنر منتخب کیے جاتے ہیں باقی صوبائی پارلیمنٹ ان کا نہیں ہوتا، البتہ بلدیاتی نظام ان کا موجود ہے۔ ایک بات میں اور بھی واضح کروں کیونکہ اکثر لوگ دو چیزوں کو اس میں خلط کر دیتے ہیں ایک ولایت فقیہ ہے اور ایک نظام مرجعیت۔

نظام مرجعی کیا ہے؟

جب وہاں کے علما میں ملکہ اجتہاد آجاتا ہے مطلب وہ فقہ میں مہارت تامہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ پہلے نجف میں سب سے بڑا مرکز تھا اور اب قم میں فقہاء کے لئے سب سے بڑا مرکز بن گیا ہے۔ دوسرے شہروں میں بھی مراکز بنے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی شیعہ عوام تقلید کرتے ہیں ان کو مرجع کہتے ہیں کہ یہاں ضروری ہے کہ زندہ مجتہد کی تقلید کی جائے وہ کہتے ہیں مردہ مجتہد کی تقلید نہیں ہوسکتی۔

ہاں اگر زندہ مجتہد مردہ مجتہد کی تقلید کی دعوت دی ہو تو پھر جائز ہے اس کو نظام مرجعی کہتے ہیں۔ شیعہ اپنے مالی معاملات میں بھی ان سے پوچھ کر کرتے ہیں جو تصور شیعہ میں متعارف ہے وہ علما طلبا مدارس کو دیتے ہیں۔

سوال: آپ نے جو آخری بات کی۔ نظام مرجعیت کے حوالے سے۔ اس کی کچھ وضاحت کیجئے۔ نظام مرجعیت میں کتنے ممبر ہونے چاہئے؟ پاکستان کی آبادی کا تقریبا بیس فیصد اہل تشیع ہیں کیا یہ لوگ اس نظام کے تحت عمل کرتے ہیں؟

جواب: اس پر کوئی پابندی نہیں پاکستان میں بھی ایسے کئی شیعہ علما موجود ہے جن کو ہم مجتہد کہہ سکتے ہیں البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کی تقلید کی جائے۔ وہاں ایسے لوگ کثیر تعداد میں موجود ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے۔ ماحول کے اثرات بڑے اثر پزیر ہوتے ہیں۔ وہاں اس چیز کا رواج ہے۔ فقہاء کی تربیت کے لئے باقاعدہ کلاسیں ہوتی ہے۔ وہاں بہترین صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔

سوال: ولی فقیہ ایک ہوتا ہے یا زیادہ؟ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ایران میں ایک اور تبدیلی آئی ہے۔ ولی فقیہ ایک ہوتا ہے۔ مطلب ایک شخص کی تقلید کرنا ضروری ہے۔ اس میں کافی خرابیاں تھی۔ مشکلات پیش آرہی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے بعد میں مرجع لفظ کی بجائے مجتہد کر دیا۔ مجتہد زیادہ ہوتے ہیں۔

سوال: ولایت فقیہ کا نفاذ کس حد تک ضروری ہے؟

جواب: آپ کو سوال یوں کرنا چاہئے تھا کہ اسلامی حکومت کا نفاذ کس حد تک ضروری ہے۔خلافت اور ولایت فقیہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔دونوں قرآن و سنت کی نفاذ چاہتے ہیں۔اہل سنت اور اہل تشیع کے تقریبا اسی فیصد مسائل بھی متفق علیہ ہیں صرف بیس فیصد مسائل میں اختلاف ہے۔جس کے لئے بھی انتظام ناممکن نہیں ہے۔

آب دیکھئے پاکستان میں میں سنیوں کی اکثریت ہے۔ یہ بات شیعہ بھی جانتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے ۔ہم اپنے شیعوں کو بھی یہ بات کہتے رہے ہیں۔ ایران کے سابق چیف جسٹس آیت اللہ موسوی کا یہ کہنا ہے کہ مجھے دس سال چیف جسٹس رہتے ہوئے شاذ و نادر کوئی ایسا مسئلہ پیش آیا جو شیعہ اور سنیوں کے ہاں سے مختلف ہو۔ہاں چار یا پانچ اہم مسائل ہیں ان کا بھی کوئی حل نکالا جاسکتا ہے اگر دونوں سمجھنے کی کوشش کریں تو۔ اگر پاکستان میں فقہ حنفی نافذ ہوجائے تو اس کا مطلب ہے کہ پچانوے فیصد فقہ جعفریہ بھی نافذ ہوجائے گا۔یا اگر ایران میں فقہ جعفری نافذ ہے تو اس کا مطلب ہے وہاں پر پچانوے فیصد فقہ حنفی نافذ ہے۔

سول ملٹری تعلقات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) نعیم خالد لودھی صاحب
سیکرٹری دفاع

سب سے پہلے میں اس محفل کے شرکاء اور منتظمین کا بہت مشکور ہوں، آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔ ایسی موضوعات وقت کی ضرورت ہے، اس پر کئی کئی نشستیں رکھنی چاہئے تا کہ ذہنوں کی الجھنیں دور ہو۔ یہ موضوع عام معمول سے کچھ ہٹ کر ہے اس وجہ سے اکثر لوگ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ چاہے جتنا بھی الجھن والا سبجیکٹ ہو اس پہ بات ضرور کرنی چاہیے

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا تھا

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہے گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں

سب سے پہلے میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہوں گا کہ آپ ذہنوں کو خالی کر کے میری بات سننے کی کوشش کریں، تب ہی اس کا فائدہ ہوسکتا ہے۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض اوقات لوگ اپنے سوچ، نظریہ اور تخیل پر اس قدر بضد ہوتے ہے کہ وہ جس چیز پر یقین رکھے ہوتے ہیں اس پر اس قدر سختی سے عمل کر رہے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی لوجک اس کی ذہن میں سرایت نہیں کرتی۔

میں آپ کے سامنے اپنا مدعا رکھوں گا اور اس کو منطقی طور پر پروف کرنے کی کوشش کروں گا۔ جو باتیں میں خود سمجھا ہوں وہ آپکے سامنے بیان کروں گا۔ آخر میں سوال جواب کی نشست ہوگی، آگر کوئی بات رہ گئی ہوگی جس پر آپ سمجھتے ہو کہ بات ہونی چاہئے تو ہم اس پر بھی بات کریں گے۔

سول ملٹری تعلقات کے مسائل

سول ملٹری ریلیشن شپ کے مسائل نئے نہیں ہے۔ یہ بہت قدیم اور پیچیدہ مسائل ہے۔ اس پر لوگوں نے تحقیقات کی ہے۔ کتابیں لکھی گئی ہے۔ اگر آپ دیکھیں گے تو غیر ترقی یافتہ ممالک میں ملٹری کے اثر ورسوخ بہت بڑھ کر ہوتا ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں سول ملٹری مسائل ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ ہم یہاں ان مسائل پر بات کریں گے نہ وہ ہمارے موضوع کا حصہ ہے بلکہ ہم سول ملٹری ریلیشن پر بات کرنی ہے۔

آپ لوگوں نے دنیا بھر کے ممالک میں دیکھا ہوگا۔ جہاں بھی سول انسٹیٹیوشن مضبوط ہو اور وہ اپنا کام صحیح طریقے سے کر رہیں ہو تو وہاں یہ مسائل بہت کم ہوتے ہیں۔'' کلچر سیولائزیشن'' ایک بین الاقوامی ادارہ ہے۔ انہوں نے ان چیزوں پر تحقیق کی ہے۔ کہ اگر کوئی ملک سول ملٹری ریلیشن شپ کو صحیح طریقے سے ہینڈل نہیں کر پائے تو وہاں بہت سے خرابیاں رونما ہوتیں ہیں۔

امریکہ میں سول ملٹری تعلقات

ہمیں سول ملٹری ریلیشن شپ کے مسائل کو صرف پاکستان کی حد تک نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ دنیا بھر میں اس حوالے سے کیا کچھ ہوا اور ہو رہا ہے کا جاننا بھی ضروری ہے۔ ہمارا تعلق چوں کہ پاکستان سے ہے اس وجہ سے ہم اکثر یہاں کے سول ملٹری تعلقات کے حوالے سے بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ باقی ملکوں کے حالات کیسے ہیں؟ جہاں ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں پر کوئی ملٹری ایشو نہیں؟ جیسے ملٹری ایشو سے مکمل آزاد ملک کے بارے میں ہم سوچتے ہیں تو امریکا اور چند دوسرے ترقی یافتہ ممالک ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ خود غور کر لیں ان کا صدر بعض اوقات ایک کام کرنے کا اعلان کر تو لیتا ہے مگر اس کو کر نہیں پاتا۔ امریکہ کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ان کا صدر افغانستان سے نکلنے کی بات کر رہا ہے۔ یہ بات کرتے کرتے کتنا ٹائم ہوگیا ہے مگر

وہ نہیں نکل پا رہے۔

کون کیا کر رہا ہے؟

کون انہیں نکلنے نہیں دے رہا؟

یہ باتیں سوچنے لائق ہے۔اس پر آپ غور وفکر کیجئے۔

روس میں سول ملٹری تعلقات

اسی طرح روس کی مثال لے لیں ۔روس کا صدر ایک انٹیلی جنس ادارے کا سربراہ تھا۔آہستہ آہستہ پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔وہ بے شک دکھانے کے لئے انتخابات کرتے ہیں ۔مگر حقیقت میں وہ وہاں قابض ہوکر ہائی جیکنگ کے زریعے آیا ہوا ہے۔یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہو۔ ہمارے ہاں یہ چیزیں بہت صاف اور کھل کر آنکھوں کے سامنے کی جاتی ہے اس لئے ہمیں سب کچھ محسوس ہوجاتا ہے ۔کچھ عرصہ میں ڈیفنس منسٹر رہ چکا ہوں۔ روس کے کچھ عہدیدار ملنے آئے۔ وہ وردی میں ملبوس تھے۔چین آپ کا پڑوسی ملک ہے۔چین میں جتنے بھی عہدیدار ہوتے ہیں سب کے سب وردی پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔

میرے کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہیکہ دنیا بھر میں جو غلطیاں ہورہی ہے ہم بھی اپنے ہاں اس کی حمایت کرتے رہے بلکہ بتانا یہ مقصود ہو کہ سب ہمارے سامنے ہو اور پھر ہم کوئی نقطہ اٹھائے۔

اختیارات کی جنگ

ملکی سطح پر مسائل صرف سول ملٹری کے درمیان نہیں ہے بلکہ یہ اختیارات کی جنگ ہے۔یہ سول ملٹری میں بھی ہے۔ملٹری ملٹری میں بھی ہے اور سول اور سول کے درمیان بھی موجود ہے۔الیکشن کمیشن کو گورنمنٹ کچھ کہتی ہیں وہ کرتی کچھ اور ہے۔

فوج معاشرے کا حصہ ہے

سول ملٹری تناو کے ذیل میں اکثر لوگ فوج کو ایک طرف اور باقی عوام بشمول سبھی

اداروں کے دوسرے طرف فرض کرلیتے ہیں،ایسا نہیں ہونا چاہئے۔میں ہمیشہ سے یہ بات کہتا رہتا ہوں کہ فوج میں بھرتی ہونے والے آسمان سے تو نہیں آئے ہیں وہ اسی سوسائٹی کے باشندے ہیں،معاشرے میں جتنی تناسب برائی کی موجود ہے ظاہر بات ہے فوج میں بھی اتنی تناسب برائی موجود ہوگی۔کسی ادارے کے سارے افراد ٹھیک ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے

جمہوریت کیا ہے؟

Goverment of The People by The people for the people

حکومت کیا کر رہی ہے؟ یہ سوال ملک کے ہر شہری کا حق ہے۔وہ شہری چاہے فوجی ہو یا عام شہری۔بدقسمتی سے ہمارے ہاں کوئی اور یہ سوال کریں تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔فوج کریں تو سب نقطہ چینی شروع کردیتے ہیں۔میرے خیال میں تو یہ نقطہ چینی بھی درست ہے کیوں کہ فوج کے پاس طاقت ہے۔طاقت ور جب اعتراض کرتا ہے تو ان سے سوال ہوتا ہے کہ آپ کیوں بول رہے ہو؟ آپ کے پاس طاقت ہے، کچھ کرکے دکھایئے۔لیکن بات اصل یہ ہے ایک خاندان کے پورے افراد فوج میں نہیں ہوتے، اکثریت سویلین کی ہوتی ہے۔ملک مسائل کے شکار ہوتے ہیں تو فوجیوں کے اہل وعیال اور خاندان کو بھی مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔اس کو اسی پیرائے میں لینا چاہئے کہ باقی لوگ جس طرح رائے دے سکتے ہیں اسی طرح ایک فوجی بھی اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔

پاکستان فلاحی ریاست کیوں نہیں بن سکا

تاریخ سے تو آپ لوگ واقف ہوں گے۔پاکستان کے بنتے ہی بہت سارے واقعات رونما ہوئے۔پاکستان کو کمزور کرنے اور صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوششیں کی گئی۔کانگریس راہنماوں کے بیانات شاہد ہیں۔وہ کہہ رہے ہوتے تھے ان لوگوں کو الگ ہونے دو،زیادہ دیر الگ نہیں رہ سکیں گے اور واپس ہندوستان میں ضم ہوجائیں گے۔اسی طرح مسئلہ کشمیر بھی آزادی کے فوراً سامنے آیا۔ان مسائل کا تقاضہ تھا جو پاکستان نے روز اول سے دفاع پر زیادہ توجہ دی تاکہ اپنی بقا کو یقینی بنایا جاسکے۔

فوج کی سیاست میں مداخلت

۱۸۵۷ جنگ آزادی کے بعد سامراجی حکومت نے فوج اور سیاستدانوں کو عوام کے خلاف استعمال کیا۔ یہ ایک صدی کی عادت تھی اتنی آسانی سے جانے والی نہیں تھی۔ پاکستان بنا تو دو چند کے سوا اکثر ادارے منظّم نہیں تھے۔ پورا نظام درہم برہم تھا۔فوج کے اندر منظّم اور مربوط نظام تھا۔ یوں فوج نے بہت جلد دوسرے اداروں میں ایک جداگانہ حیثیت اختیار کرلی جو بعد میں سیاسی مداخلت تک جا پہنچی۔

اس کے علاوہ ہماری ایک بدقسمتی یہ ہوگئی کہ ہمارے بڑے اور بااثر لیڈر بہت جلد فوت ہوگئے۔ وہ ایسے لوگ تھے جو چیزوں کو کنٹرول کر سکتے تھے۔ان کے جانے کے بعد جو لوگ آئے وہ کمزور سیاستدان تھے۔انہوں نے دفاعی اداروں کے سربراہان کو اپنے ساتھ کابینہ میں شامل کیا۔ظاہر بات ہے۔ جب آپ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرسکیں گے اور اس کو دوسروں کے کندھوں پر ڈال دیں گے تب آپ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ان کے ذہن میں اس خیال کا آنا لازمی بات ہے کہ جب سب کچھ میں کررہا ہوں تو یہ کیوں یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ پھر ضرور وہاں مداخلت کرے گا۔راستہ تو آپ نے دکھادیا ہے۔

فوجی لیڈرشپ کی ناکامی

آپ اگر دیکھیں تو فوجی ادوار میں ملک نے بہت ترقی کی۔معیشت ہماری مستحکم ہوئی، دفاعی صلاحیت میں اضافہ ہوا اور ادارے منظّم ہوئے لیکن بدقسمتی سے فوجی سربراہان کے پاس سیاسی سوچ نہیں تھی جو چیزوں کو بڑے صبر وتحمل سے دیکھیں اور پھر کوئی مثبت فیصلہ کریں،مشرقی پاکستان کا قضیہ ہو یا یہ فیصلہ کہ ہمیں ورلڈ وار کا حصہ ہونا چاہئے یا نہیں، میرے خیال میں ملٹری لیڈرشپ نے جب بھی ٹیک اور کیا ہے وہ اس چیز میں ناکام ہوئے ہیں۔

سیاست دانوں کی کمزوری

بدقسمتی سے سیاسی پارٹیوں اور سیاستدانوں کو حکومت کرنے کا جتنا بھی موقع ملا،اس میں وہ کوئی خاطر خواہ کام نہیں کرپائے۔اگر چہ وہ اس کا قصور وار فوج کو ٹھہراتے

ہیں کہ انہوں نے کام نہیں کرنے دیا لیکن بہر حال ذمہ داری تو ان لوگوں کی تھی۔ اختیارات تو انہیں کے ہاتھوں میں تھی۔اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ کسی کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام دی جائے پھر کہے گھوڑا تو کوئی اور موڑ رہا ہے تو اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ اس میں اتنا دم نہیں ہے کسی اور کو گھوڑا موڑنے سے روکے،تو یہ کمزوری ہے۔

جمہوریت کا استحکام کیسے ہوگا

میرے خیال میں اگر نیشنل سیکورٹی کمیٹی بار بار بنائی جائے،وہاں ہر کسی کو بات کرنے کا موقع دیا جائے تو شاید یہ موجود دور یہ کم ہو اور افہام وتفہیم کے ذریعے آگے چلا جاسکیں۔دوسری بات یہ ہے کہ سیاستدان اپنے نالج اور فہم کو اس لیول تک بڑھائے جہاں سے وہ معاملات کو ہینڈل کرسکتے ہو۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک بندہ اس بنیاد پر دوسرے شخص کی کام میں دخل دیں کہ میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ایسا نہیں ہونی چاہئے۔لیکن فوج کی طرف سے جب کوئی بات سامنے آتی ہے تو اسے تجویز سمجھنا چاہئے۔ پوری دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں فوج اتنی طاقت ور ہے اور انہیں مسائل کو ہینڈل کرنے کا اتنا تجربہ ہو چکا ہے کہ ہم انہیں نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ہر بڑا قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں ان سے مشورہ کرنا چاہئے۔میرے خیال میں حالات بہتر ہوں گے۔

فوج کوئی ان پڑھ طبقہ بھی نہیں ہے۔آپ کو کوئی جنرل ایسا نہیں ملے گا۔انہوں نے ماسٹر،ایم فل یا پی ایچ ڈی نہ کی ہو۔میں خود انجنیئر ہوں،میں نے ڈبل ماسٹر کئے ہوئے ہیں۔آپ اگر ملٹری نظام کو دیکھیں،وہاں سکیل بڑھنے سے نالج میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے حتی جب وہ جنرل بنتا ہے تو اسے بین الاقوامی تعلقات کے متعلق بھی جانکاری ہوتی ہے۔وہاں کس طرح بہتر کام کیا جاسکتا ہے۔اس سے بھی وہ لوگ واقف ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے سیاستدان اس چیز سے واقف نہیں ہوتے۔

اس لئے باہمی مکالمے سے ہم سول ملٹری تعلقات کو improve کرسکتے ہیں۔